الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

غلطی پر سرکشی کا اضافہ نہ کیجیے
کیوں کہ اللہ کے یہاں ——————
غلطی قابل معافی ہے مگر سرکشی قابل معافی نہیں

جولائی ۱۹۸۶ شمارہ ۱۱۶

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر	40/-
تذکیر القرآن جلد اوّل	80/-
الاسلام	25/-
مذہب اور جدید چیلنج	25/-
ظہورِ اسلام	25/-
احیاءِ اسلام	20/-
پیغمبرِ انقلاب	30/-
سوشلزم اور اسلام	25/-
صراط مستقیم	25/-
اسلامی زندگی	20/-
اسلام اور عصر حاضر	20/-
دین کیا ہے	3/-
قرآن کا مطلوب انسان	6/-
تجدید دین	4/-
اسلام دینِ فطرت	4/-
تعمیرِ ملت	4/-
تاریخ کا سبق	4/-
مذہب اور سائنس	6/-
عقلیاتِ اسلام	4/-
فسادات کا مسئلہ	2/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	2/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	4/-

ایمانی طاقت	4/-
اتحادِ ملت	4/-
سبق آموز واقعات	4/-
زلزلۂ قیامت	5/-
حقیقت کی تلاش	4/-
پیغمبر اسلام	4/-
حقیقتِ حج	4/-
آخری سفر	4/-
اسلامی دعوت	4/-
خدا اور انسان	4/-
حل یہاں ہے	6/-
سچّا راستہ	2/-
دینی تعلیم	4/-
حیاتِ طیبہ	4/-
باغِ جنت	4/-
نارِ جہنم	4/-
تبلیغی تحریک	12/-
دین کی سیاسی تعبیر	10/-
عظمتِ قرآن	25/-

Muhammad: The Prophet of Revolution	50/-
The Way to Find God	4/-
The Teachings of Islam	5/-
The Good Life	5/-
The Garden of Paradise	5/-
The Fire of Hell	5/-
Muhammad: The Ideal Character	4/
Man Know Thyself	4/-

مکتبہ الرسالہ سی - ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۱۶ — جولائی ۱۹۸۶

فہرست

تاخیر نہیں	صفحہ ۲	ایک تاثر	صفحہ ۱۳
مل کر کام کرنا	۳	کامیابی کے لیے	۱۴
سڑک کا سبق	۴	خوشی کا راز	۱۵
دوسروں کا لحاظ	۵	تاریخ سازی	۱۶
برائی کی جڑ	۶	حوصلہ مندی	۱۷
اجتماعی عمل	۷	اسلام اور سائنس	۱۸
کامیاب تدبیر	۸	ایک خط و کتابت	۴۰
سمجھ دار کون	۹	تعمیر ملّت	۴۵
بڑا آدمی	۱۰	خبر نامہ اسلامی مرکز - ۲۱	۴۶
ڈیگال ازم	۱۱	ایجنسی الرسالہ	۴۸

تاخیر نہیں

میڈیکل کالج کا پروفیسر زبانی امتحان لے رہا تھا۔ اس نے طالب علم سے پوچھا " تم ان میں سے کتنی گولیاں اس شخص کو دوگے جس کو دل کا دورہ پڑا ہو " طالب علم نے جواب دیا " چار " ایک منٹ بعد طالب علم نے دوبارہ کہا " پروفیسر، کیا میں اپنا جواب بدل سکتا ہوں " پروفیسر نے کہا " ہاں ضرور "۔ اس کے بعد پروفیسر نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا " مگر مجھے افسوس ہے کہ تمہارا مریض ۴۰ سکنڈ پہلے مر چکا ہے۔

The Medical-College professor was giving an oral examination. "How many of these pills," he asked, "would you give a man who had a heart attack?" "Four," replied the student. A minute later he piped up. "Professor, can I change my answer?" "You can, by all means," said the professor, looking at his watch. "But, regrettably, your patient has already been dead for 40 seconds."

ایک شخص جس کو دل کا دورہ پڑا ہوا ہو وہ نہایت نازک حالت میں ہوتا ہے۔ اس کو فوری طور پر دوا کی بھرپور خوراک دینا انتہائی ضروری ہے۔ اگر اس کو فوری طور پر بھرپور دوا نہ ملے تو اگلے لمحہ کا تقاضا صرف یہ ہوگا کہ اس آدمی کو ڈاکٹر کے بجائے گورکن کے حوالہ کیا جائے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ بعض معاملات اتنے نازک ہوتے ہیں کہ وہ بلا تاخیر درست کارروائی کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسے معاملات میں آدمی کو فی الفور قطعی فیصلہ لینا پڑتا ہے اگر آدمی فوراً بھرپور فیصلہ نہ لے سکے تو وہ یقینی طور پر ناکام رہے گا۔ اگلا لمحہ جو اس پر آئے گا وہ صرف اس کی حسرت میں اضافہ کرنے کے لیے ہوگا نہ کہ اس کی کامیابی کے باب کو مکمل کرنے کے لیے۔

زندگی کے سفر کی مثال ٹرین کے سفر کی ہے۔ ٹرین ہمیشہ مقررہ وقت پر اسٹیشن پر آتی ہے۔ اور چند منٹ رک کر دوبارہ آگے کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں صرف وہی شخص ٹرین میں اپنی جگہ پا سکتا ہے جو ضروری تیاری کے ساتھ ٹھیک وقت پر پلیٹ فارم پر موجود ہو۔ ورنہ ٹرین آئے گی اور اس کو لیے بغیر آگے چلی جائے گی۔ اسی طرح مواقع ہمیشہ اپنے وقت پر آتے ہیں۔ مگر مواقع کسی کے لیے ترقی کا زینہ بن جاتے ہیں اور کسی کے لیے محرومی کا اعلان۔

مل کر کام کرنا

شہد کی تیاری ایک بے حد محنت طلب کام ہے۔ بہت سی مکھیاں لگاتار رات دن کام کرتی ہیں تب وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو شہد کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی ایک پھول میں اس کی مقدار بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بے شمار پھولوں کا رس جمع کیا جاتا ہے تب کہیں یہ ہوتا ہے کہ شہد کی قابل لحاظ مقدار تیار ہو سکے۔

ایک پونڈ (نصف کیلو) شہد تیار کرنے کے لیے شہد کی مکھیوں کو مجموعی طور پر بعض اوقات تین لاکھ میل کا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ ایک مکھی کی عمر چند مہینے سے زیادہ نہیں ہوتی اس لیے کوئی ایک مکھی تنہا ایک پونڈ شہد تیار نہیں کر سکتی، خواہ وہ اپنی عمر کا ہر لمحہ پھولوں کا رس جمع کرنے میں لگا دے۔

اس مشکل کا حل شہد کی مکھیوں نے اجتماعی کوشش میں تلاش کیا ہے۔ یعنی جو کام ایک مکھی نہیں کر سکتی اس کو لاکھوں مکھیاں مل کر انجام دیتی ہیں۔ جو کام "ایک" کے لیے ناممکن ہے وہ اس وقت ممکن بن جاتا ہے جب کہ کرنے والے "لاکھوں" ہو گئے ہوں۔

یہ قدرت کا سبق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن تھا کہ شہد کے بڑے بڑے ذخیرے زمین پر رکھ دے جس طرح پٹرول اور پانی کے ذخیرے بہت بڑی مقدار میں زمین پر جگہ جگہ موجود ہیں۔ مگر شہد کی تیاری کو اللہ نے ایک بے حد پیچیدہ نظام سے وابستہ کر دیا۔ اس حیرت انگیز نظام کے اندر انسان کے لیے بے شمار سبق ہیں۔ ان میں سے ایک سبق وہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔

انسانی زندگی میں کچھ کام ایسے ہیں جن کو ہر آدمی کم وقت میں اپنی ذاتی کوشش سے انجام دے سکتا ہے۔ مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کو کوئی شخص تنہا انجام نہیں دے سکتا۔ ایسے کام کو واقعہ بنانے کی واحد ممکن شکل وہی ہے جو شہد کی مکھی کی مثال میں نظر آتی ہے۔ یعنی بہت سے لوگ مل کر اسے انجام دیں۔

تاہم مل کر کام کرنا ہمیشہ ایک قربانی کی قیمت پر ہوتا ہے، اور وہ قیمت صبر ہے۔ فرد کے اندر اٹھنے والے باغیانہ جذبات کو کچلنا ہی وہ چیز ہے جو اجتماعی عمل کو ممکن بناتی ہے۔ اس قربانی کے بغیر کبھی اجتماعی عمل ظہور میں نہیں آتا۔

سڑک کا سبق

شہر کی مصروف سڑکوں پر ہر وقت حادثہ کا خطرہ رہتا ہے۔ چنانچہ ٹریفک کی رہنمائی کے لیے سڑکوں پر مختلف ہدایات لکھ دی جاتی ہیں۔ ان ہدایات میں سے ایک یہ ہے کہ پٹڑی پر چلنا محفوظ چلنا ہے :

Lane driving is sane driving.

یعنی آدمی اگر پٹڑی کا پابند رہتے ہوئے اپنی سواری چلائے تو وہ اپنے آپ کو حادثات سے بچا سکتا ہے۔ وہ اس خطرہ سے محفوظ رہ سکتا ہے کہ دوسری گاڑیوں سے اس کا ٹکراؤ ہو اور وہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے کے بجائے قبرستان کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو جائے۔

لندن کے ایک ڈرائیور نے ایک بار ایک مضمون شائع کیا اس میں اس نے ٹریفک کے مختلف اصول بتائے۔ اس نے اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں بڑی عجیب عجیب باتیں لکھی تھیں۔ مثلاً اس نے لکھا کہ آپ اپنی گاڑی سڑک پر دوڑاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں کہ اچانک سائڈ کی گلی سے ایک گیند سڑک پر آگئی یہ گیند دیکھ کر آپ کو جاننا پڑتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک بچہ بھی آرہا ہوگا۔ اگر آپ صرف "گیند" کو دیکھیں اور "بچہ" کو نہ دیکھیں تو آپ اچھے ڈرائیور نہیں ہیں۔ اچھا ڈرائیور صرف وہ ہے جو گیند کو دیکھتے ہی بچہ کو بھی دیکھ لے، اگرچہ اس وقت بچہ بظاہر اس کی آنکھوں کے سامنے نہ ہو۔ اگر ڈرائیور نے گیند کو دیکھ کر اپنی گاڑی کو بریک نہیں لگایا تو یقینی ہے کہ اگلے لمحہ اس کی گاڑی ایک بچہ کو سڑک پر کچل چکی ہوگی۔

سڑک کا سفر زندگی کے سفر کا معلّم ہے۔ آدمی اگر چاہے تو سڑک کے سفر سے وہ سب کچھ سیکھ سکتا ہے جو اس کو زندگی کے زیادہ بڑے سفر کے لیے درکار ہے۔

اپنی سرگرمیوں کو ہمیشہ اپنے دائرہ میں محدود رکھیے۔ اگر آپ نے دوسرے کے دائرہ میں مداخلت کی تو فوراً اس سے آپ کا ٹکراؤ شروع ہو جائے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کا جاری سفر رک جائے گا۔ اجتماعی زندگی میں جب خارج سے ایک علامت ظاہر ہو تو یہ جاننے کی کوشش کیجئے کہ اس علامت کے پیچھے اور کیا باتیں ہیں جو اگرچہ موجود ہیں۔ لیکن بروقت وہ دکھائی نہیں دے رہی ہیں۔ اگر آپ نے صرف دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھا اور جو چیزیں دکھائی نہیں دے رہی ہیں ان سے بے خبر رہے تو مقابلہ کی اس دنیا میں آپ کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

دوسروں کا لحاظ

کیپ ہیل راجرس پولٹری کے عالمی شہرت یافتہ ماہر ہیں۔ پولٹری (مرغ بانی) پر ان کی ایک مشہور کتاب ہے۔ یہ کتاب ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے: بڑے پیمانہ کی کامیاب پولٹری فارمنگ بڑی حد تک ایک مزاجی کیفیت کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص جو چڑیوں اور جانوروں کے لیے شفقت کا جذبہ نہ رکھتا ہو وہ اس کام میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پولٹری فارمنگ کے لیے سخت اور صبر آزما قسم کا روٹین کا کام (Routine work) بے حد ضروری ہے۔ یہ کام ان لوگوں کو بہت اکتا دینے والا معلوم ہوگا جو ایک ہی کام کو ہر روز کرنے کے عادی نہ ہو، اور وہ بھی بغیر اس امید کے کبھی اس میں انقطاع یا تعطیل کا دن آسکتا ہے۔

Success is a matter of cooled decisions, without constant hovering and changing of the mind, acute observation, initiative, and unremitting attention to a vast amount of petty details.

A.C. Campbell Rogers.
Profitable Poultry Keeping in India and the East.
D.B. Taraporevala Sons & Co., Bombay 1959, p. 223

کامیابی ایک ٹھنڈے فیصلوں کا معاملہ ہے، بغیر اس کے کہ آدمی اِدھر اُدھر مڑے یا ذہن کو بدلے۔ گہرائی کے ساتھ مشاہدہ، اقدام، اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی بہت بڑی تعداد پر مسلسل اور غیر منقطع توجہ۔

مرغبانی کے ماہر نے جو بات مرغبانی کے لیے کہی ہے وہی عام زندگی کے لیے بھی صحیح ہے۔ جس طرح مرغیاں پالنے والا شخص صرف اپنی مرضی پر نہیں چلتا بلکہ وہ مرغیوں کی عادات اور ان کی ضروریات کا لحاظ کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں ہمیں دوسرے انسانوں کے مزاج اور ان کے مفادات کی رعایت کرنا ہے۔ دوسروں کی عزت کر کے ہی ہم دوسروں کے درمیان عزت پا سکتے ہیں۔ دوسروں کے لیے مفید بن کر ہی ہم دوسروں کو اپنے لیے مفید بنا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں ذاتی کامیابی دراصل دوسروں کی کامیابی میں مددگار بننے کا نام ہے۔ جو لوگ صرف اپنے کو جانیں اور دوسروں کو نہ جانیں وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

برائی کی جڑ

ولیم لا (۱۷۶۱ - ۱۶۸۶) ایک مشہور انگریز مصنف ہے۔ اس نے اخلاقیات کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے ——— برائی جب بھی شروع ہوتی ہے غرور سے شروع ہوتی ہے۔ برائی کا جب بھی خاتمہ ہوتا ہے تو انکساری کے ذریعہ ہوتا ہے:

Evil can have no beginning, but from pride,
nor any end but from humility. (William Law)

کہنے والے نے یہ بات اخلاقی اعتبار سے کہی ہے۔ مگر آسمانی شریعت کی بات بھی یہی ہے۔ خدا کے نزدیک کسی آدمی کا سب سے بڑا جرم شرک اور غرور ہے۔ ہر چیز کی معافی ہو سکتی ہے مگر شرک اور غرور کی معافی نہیں۔

ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں جو بھی ظلم یا فساد کرتا ہے ان سب کی جڑ میں کھلا یا چھپا ہوا غرور شامل رہتا ہے۔ غرور کی وجہ سے آدمی حق کا اعتراف نہیں کرتا، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ حق کا اعتراف کرنے سے اس کی بڑائی ختم ہو جائے گی۔ وہ بھول جاتا ہے کہ حق کو نہ مان کر وہ حق کے مقابلہ میں خود اپنی ذات کو برتر قرار دے رہا ہے۔ حالاں کہ اس دنیا میں سب سے بڑی چیز حق ہے نہ کہ کسی کی ذات۔

جس آدمی کے مزاج میں غرور ہو وہ اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو حقیقتِ واقعہ کے مطابق بنائے۔ وہ وہی کرے جو از روئے حقیقت اس کو کرنا چاہیے اور وہ نہ کرے جو از روئے حقیقت اس کو نہیں کرنا چاہیے۔

مگر مغرور آدمی کا برتری کا مزاج اس کے لیے اس میں مانع بن جاتا ہے کہ وہ اپنے کو حقیقت کے مطابق ڈھالے۔ وہ چاہتا ہے کہ حقیقت خود اُس کے مطابق ڈھل جائے۔ چوں کہ عملاً ایسا ہونا ممکن نہیں، اس لیے ایسے آدمی کا اس دنیا میں کامیاب ہونا بھی ممکن نہیں۔

اجتماعی عمل

امریکہ کے جہاز ساز کارخانے ۵۰ ہزار ٹن کا ایک ٹینکر ۱۶ مہینے میں بناتے ہیں اور اسپین میں وہ ۲۴ مہینے میں بن کر تیار ہوتا ہے۔ مگر جاپان کے جہاز ساز اسی ٹینکر کو صرف آٹھ مہینے میں بنا لیتے ہیں۔

اس جاپانی معجزہ کا راز کیا ہے۔ مغربی ماہرین نے مکمل جائزہ کے بعد بتایا ہے کہ اس کی خاص وجہ متحدہ عمل (Team Work) ہے۔ جاپان کے کاریگر اور منتظمین اور افسران سب حد درجہ اتحاد کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ عمل کے دوران کسی بھی مرحلہ میں ان کا اتحاد ٹوٹتا نہیں۔ اس کا نتیجہ انھیں کم وقت میں معیاری سامان کی صورت میں مل رہا ہے۔

جاپانی کلچر اور طریق کار میں اجتماعی ہم آہنگی (Group Harmony) رچی بسی ہوئی ہے۔ خاندان میں، کارخانہ میں، چھوٹے اداروں اور بڑے اداروں کے درمیان ہر جگہ ہم آہنگی جاپانی کیرکٹر کا امتیازی وصف (Distinctive Feature) بن چکا ہے۔ جاپانی امور کے ایک ماہر ولیم اوشی (William Ouchi) کے الفاظ میں:

> Every activity in Japan is group activity, and not a spring-board to individual glory and personal advertisement.
> *The Hindustan Times*, February 16, 1986

جاپان میں ہر سرگرمی اجتماعی سرگرمی ہے۔ وہاں کوئی سرگرمی انفرادی عظمت یا شخصی اشتہار کا ذریعہ نہیں بنائی جاتی۔

جاپانیوں کی یہ خصوصیت ان کی قومی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ زیادہ بڑی ترقی ہمیشہ اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ زیادہ بڑی تعداد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرے۔ مل کر کام کرنے میں اصل رکاوٹ یہ ہے کہ افراد کی انفرادی شخصیت اس میں نہیں ابھرتی۔ جس قوم کے افراد میں اپنی انفرادی شخصیت بنانے کا مزاج ہو وہ قوم کبھی متحدہ عمل میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اور اسی لیے وہ کوئی بڑی ترقی بھی نہیں کر سکتی۔

بڑی ترقی حاصل کرنے کا سب سے آسان طریقہ اتحاد ہے۔ اتحاد ایک کو کئی بنا دیتا ہے، وہ کوشش کی مقدار کو ہزار گنا زیادہ کر دیتا ہے۔

کامیاب تدبیر

جیل سے فرار موجودہ زمانہ میں ایک آرٹ بن گیا ہے۔ اخبارات میں اس کی مثالیں آتی رہتی ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک دل چسپ واقعہ وہ ہے جو ۲۶ مئی ۱۹۸۶ کو پیرس میں پیش آیا۔

ترقی یافتہ مغربی ملکوں میں ہوائی جہاز اور ہیلی کاپٹر عام استعمال کی چیز بن گیے ہیں۔ وہاں کوئی شخص اسی طرح ایک ہیلی کاپٹر کرایہ پر لے سکتا ہے جس طرح ہندستان جیسے ملکوں میں موٹر کار کرایہ پر حاصل کی جاتی ہے۔ مذکورہ تاریخ کو ایک ۳۰ سالہ عورت نے ایک تجارتی ادارہ ایر کانٹینٹ (Air Continent) سے ایک ہیلی کاپٹر کرایہ پر لیا۔ وہ خود اس کو اڑاتی ہوئی پیرس کے جیل (La Sante prison) کے اوپر پہونچی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک قیدی کو لے کر فرار ہو گئی۔

اس جیل میں ایک ۳۴ سالہ شخص قید تھا۔ اس کا نام مائیکل واجور (Michel Vaujour) بتایا گیا ہے۔ مسلح قزاقی کے جرم میں اس کو ۸ مارچ ۱۹۸۵ کو ۱۸ سال کی سزا ہوئی تھی۔ مذکورہ ہیلی کاپٹر ساڑھے دس بجے دن میں اڑتا ہوا جیل کی فضا میں پہونچا۔ وہ اس کی ایک چھت پر اترا اور مذکورہ قیدی کو لے کر اڑ گیا۔ یہ پوری کارروائی صرف ۵ منٹ کے اندر مکمل ہو گئی۔ جیل میں مسلح پولیس موجود تھی۔ مگر یہ ساری کارروائی اتنی اچانک اور اس قدر غیر متوقع طور پر ہوئی کہ مسلح پولیس اس کے اوپر ایک فائر بھی نہ کر سکی۔ (ٹائمس آف انڈیا، انڈین اکسپریس ۲۷ مئی ۱۹۸۶)

جب دو فریقوں میں مقابلہ ہو تو اس میں وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو مذکورہ قسم کی تدبیر اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز یہ ہے کہ حریف کو بے خبری میں پکڑ لیا جائے۔ اچانک ایسا اقدام کیا جائے جس کے متعلق فریق ثانی فوری طور پر کچھ نہ سوچ سکے۔ اس کو صرف اس وقت ہوش آئے جب کہ اس کے خلاف کارروائی اپنی کامیابی کی آخری حد پر پہونچ چکی ہو۔

مذکورہ مثال میں اس تدبیر کو ایک شخص نے مجرمانہ جارحیت کے لیے استعمال کیا۔ مگر جائز دفاع کے لیے بھی یہی تدبیر سب سے زیادہ موثر تدبیر ہے۔

سمجھ دار کون

ڈیل کارنیگی (Dale Carnegie) نے کہا کہ زندگی میں سب سے زیادہ اہم چیز کامیابیوں سے فائدہ اٹھانا نہیں ہے۔ ہر بیوقوف آدمی ایسا کر سکتا ہے۔ حقیقی معنوں میں اہم چیز یہ ہے کہ تم اپنے نقصانات سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس دوسرے کام کے لیے ذہانت درکار ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایک سمجھ دار اور ایک بے وقوف کے درمیان فرق کرتی ہے :

> The most important thing in life is not to capitalize on your gains. Any fool can do that. The really important thing is to profit from your losses. That requires intelligence; and it makes the diference between a man of sense and a fool.

اس دنیا میں اتفاقاً ہی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی صرف کامیابیوں کے درمیان ہو، اور اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی کام نہ ہو کہ وہ بس کامیابیوں سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھاتا رہے۔ بیشتر حالات میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو مشکلوں اور نقصانات کے درمیان پاتا ہے۔ اور اس کو مشکلوں اور نقصانات سے گزرتے ہوئے اپنی منزل تک پہونچنا پڑتا ہے۔

اس دنیا میں صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اس ہوش مندی کا ثبوت دیں کہ وہ ناموافق حالات کی شکایت کرنے کے بجائے ناموافق حالات کا استقبال کرنا جانتے ہیں۔ جو مشکلوں کے خلاف فریاد کرنے کے بجائے مشکلوں کو حل کرنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

"نقصان سے فائدہ اٹھانا" یہی واحد خصوصیت ہے جو اس دنیا میں کسی کو کامیاب کرتی ہے، کوئی فرد ہو یا کوئی قوم، دونوں کو اس دنیا میں اسی ایک امتحان میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ اس دنیا میں کامیاب وہ نہیں ہے جس کو مشکلیں پیش نہ آئیں۔ یہاں کامیاب وہی ہے جو مشکلوں کے باوجود کامیاب ہو سکے۔ یہاں منزل پر وہ پہونچتا ہے جو راستہ کی دشواریوں کے باوجود اپنا سفر طے کر سکے۔

بڑا آدمی

مسٹر ڈیل کارنیگی کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے :

How to Stop Worrying and Start Living

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۸ میں چھپی۔ مصنف لکھتے ہیں کہ جب میں نے پہلی بار اس کتاب کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا تو میں نے اعلان کیا کہ جو شخص اس موضوع پر بہترین حقیقی کہانی پیش کرے گا اس کو دو سو ڈالر انعام دیئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں موصول ہونے والی دو اہم ترین کہانیوں میں سے ایک کہانی وہ تھی جس کا ایک حصہ حسب ذیل ہے :

مسٹر سی آر برٹن (C.R. Burton) نے لکھا کہ جب میں نو سال کا تھا تو میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ ۱۲ سال کی عمر میں میں نے اپنے باپ کو بھی کھو دیا۔ اس کے بعد میں بے سہارا ہو کر رہ گیا۔ مجھے لوگ یتیم کہنے لگے۔

اس کے بعد مسٹر اور مسز لافٹن (Loftin) نے مجھ کو از راہ ہمدردی اپنے پاس رکھ لیا۔ انھوں نے کہا کہ تم جب تک چاہو ہمارے پاس رہ سکتے ہو۔ میں اسکول جانے لگا تو اسکول کے بچے میری اونچی ناک پر مذاق اڑاتے۔ وہ مجھے تحقیر کے طور پر یتیم بچہ (Orphan brat) کہنے لگے۔ مجھے ان کی باتوں سے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ میں چاہنے لگا کہ ان سے لڑوں۔ مگر جس چیز نے مجھے لڑائی سے بچایا وہ مسٹر لافٹن کا یہ جملہ تھا :

Always remember that it takes a bigger man to walk away from a fight than it does to stay and fight. (p. 187)

ہمیشہ یاد رکھو کہ جنگ ہر آدمی کر سکتا ہے مگر بڑا آدمی وہ ہے جو جنگ سے اعراض کرے۔

گڑھے کے اندر پتھر پھینکیں تو اس کے پانی میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر سمندر کے اندر ایک پورا پہاڑ ڈال دیجئے تب بھی وہ ویسا کا ویسا ہی رہے گا۔ اسی طرح چھوٹے ظرف والا آدمی ایک سخت بات سن کر بگڑ اٹھتا ہے۔ مگر بڑے ظرف والے آدمی کے اوپر طوفان گزر جاتے ہیں اور پھر بھی اس کا سکون برہم نہیں ہوتا۔

ڈیگال ازم

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قوم کو زندہ کرنے کے لیے فرد کو اپنے آپ کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فرانس کے چارلس ڈیگال (۱۹۷۰-۱۸۹۰) نے اس کی شاندار مثال پیش کی ہے۔

ڈیگال دسمبر ۱۹۵۸ میں فرانس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت افریقہ میں فرانس کے تقریباً ایک درجن مقبوضات تھے جن میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ خاص طور پر الجیریا میں یہ تحریک بہت شدت اختیار کر چکی تھی۔ فرانس نے اس کو کچلنے کے لیے تقریباً ۲۵ لاکھ آدمی قتل کر دیے۔ اس کے باوجود الجیریا میں آزادی کی تحریک دبتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ صورت حال چارلس ڈیگال کے لیے سخت تشویشناک بن گئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں، الجیریا کی جنگ کے مسائل ان کے لیے اس میں روک بن گیے کہ وہ مستقبل کی مثبت پالیسیوں (Positive policies) کے بارہ میں نقشہ بنانے سے زیادہ کچھ کر سکیں (جلد ۷، صفحہ ۹۶۴)

فرانس اپنے افریقی مقبوضات کو فرانس کا صوبہ (Province) کہتا تھا۔ وہ ان کی زبان اور کلچر کو اس حد تک بدل دینا چاہتا تھا کہ وہاں کے باشندے اپنے آپ کو فرانسیسی سمجھنے لگیں۔ مگر یہ منصوبہ فرانس کے لیے بہت مہنگا پڑا۔ عملاً یہ ممالک فرانس کا صوبہ نہ بن سکے اور اس غیر حقیقت پسندانہ کوشش نے خود فرانس کو ایک کمزور ملک بنا دیا۔ فرانس کی تمام بہترین طاقت مقبوضہ ممالک میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے میں استعمال ہونے لگی اور فرانس نے یورپ کی ایک عظیم طاقت (Great power) ہونے کی حیثیت کھو دی۔

سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ افریقہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں فرانس ایٹمی دور میں پیچھے ہو گیا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ چارلس ڈیگال نے محسوس کیا کہ نوآبادیاتی جنگ لڑنے کی کوشش فرانس کے لیے اس میں مانع ہو گئی ہے کہ وہ ایٹمی ہتھیار تیار کرے۔ چنانچہ ڈیگال نے الجیریا کو آزاد کر دیا۔ اور اس کے بعد مضبوط ایٹمی طاقت کو وجود میں لانے کی کوشش شروع کر دی جو فرانس کی عظیم حیثیت کے لیے نئی بنیاد بن سکے (جلد ۴، صفحہ ۹۰۵)

ڈیگال نے معاملہ کو قومی ساکھ یا ذاتی قیادت سے الگ ہو کر دیکھا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کے

بعد وہ اس رائے پر پہونچے کہ اس مسئلہ کا حقیقت پسندانہ حل صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا جائے۔ تاہم فرانس کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ فرانس کے قومی وقار (National prestige) کا مسئلہ تھا اور قومی وقار ایسی چیز ہے کہ قومیں لڑکر ہلاک ہوجاتی ہیں مگر وہ اپنے وقار کو کھونا برداشت نہیں کرتیں۔ یہ یقینی تھا کہ جو شخص اس معاملہ میں قومی وقار کے خلاف فیصلہ کرے گا وہ فرانس میں اپنی مقبولیت کو یکسر ختم کر دے گا۔ تاہم ڈیگال نے یہ خطرہ مول لے لیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں : ڈیگال نے الجیریا کے مسئلہ کو اس وقت حل کر دیا جب کہ ان کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کو حل نہیں کر سکتا تھا۔ (جلد ۷، صفحہ ۹۶۵)

جنرل ڈیگال نے اس کے بعد الجیریا کے لیڈروں کو گفت وشنید کی دعوت دی۔ اس گفت وشنید کا فیصلہ عین منصوبہ کے تحت الجیریا کے حق میں ہوا۔ یعنی حکومت فرانس اس پر راضی ہوگئی کہ الجیریا میں ریفرنڈم کرایا جائے اور لوگوں سے پوچھا جائے کہ وہ فرانس کی ماتحتی پسند کرتے ہیں یا آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ریفرنڈم ہوا۔ پیشگی اندازے کے مطابق الجیریا کے باشندوں نے آزاد الجیریا کے حق میں اپنی رائیں دیں اور اس کا احترام کرتے ہوئے حکومت فرانس نے جولائی ۱۹۶۲ میں الجیریا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس کے نتیجہ میں چارلس ڈیگال پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ ان کے اوپر قاتلانہ حملے کیے گیے۔ اس کے بعد عوام کے دباؤ کے تحت ڈیگال نے فرانس میں ایک ریفرنڈم کرایا جس میں ڈیگال کو شکست ہوئی۔ بالآخر انھوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۶۹ کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۹ نومبر ۱۹۷۰ کو ان پر قلب کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈیگال ایک معمولی قبرستان میں اس طرح دفن کر دیئے گیے کہ ان کے جنازے میں ان کے چند رشتہ داروں اور دوستوں کے سوا کوئی اور شریک نہ تھا۔ ڈیگال خود مر گیے۔ مگر انھوں نے مرکر اپنی قوم کو دوبارہ زندگی دے دی۔

ڈیگال کے اس واقعہ سے اگر ڈیگال ازم (Degaullism) کی اصطلاح بنائی جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈیگال ازم اپنی قیادت کی قیمت پر قوم کو بچانا ہے۔ برٹانیکا (۱۹۸۴) کے الفاظ میں، ڈیگال تنہا شخص تھے جن میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ ایسے نازک فیصلے لے سکیں جن سے سخت قسم کے سیاسی اور شخصی خطرات (Political and personal risks) وابستہ ہوتے ہیں (7:965)

ڈیگال ازم قومی زندگی کا راز ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کسی قوم کو ایک ڈیگال حاصل ہوجائے۔

ایک تاثر

۲۰ جنوری ۱۹۸۶ کو میں انڈین ایر لائنز کی فلائٹ نمبر ۴۳۹ کے ذریعہ دہلی سے حیدر آباد گیا۔ جہاز کے اندر حسب معمول اعلانات شروع ہوئے تو اناؤنسر نے دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی کہا :

Captain Mustafa is in command.

(کیپٹن مصطفےٰ اس جہاز کے پائلٹ ہیں) انڈین ایر لائنز میں میں نے بہت سفر کیے ہیں مگر "کیپٹن مصطفی" جیسا لفظ پہلی بار سننے میں آیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اب دیگر اعلیٰ سروسوں کے علاوہ اس ملک کی ہوائی سروسوں میں بھی داخل ہونا شروع ہو گیے ہیں۔ وہ اپنے پچھڑے پن کو ختم کر کے تیزی سے آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

ہندستان کے مسلم لیڈر ہمیشہ اپنی قوم کے نوجوانوں کے بارے میں "نکالے جانے" کی خبریں دنیا کو سناتے ہیں۔ مگر یہ سراسر ناانصافی ہے۔ ان کو چاہیے کہ اسی کے ساتھ "داخل کیے جانے" کی خبریں بھی وہ دنیا کو سنائیں تاکہ لوگوں کو تصویر کا دوسرا رُخ بھی معلوم ہو سکے۔ مسلم قائدین کا یہ عمل یقینی طور پر غیر منصفانہ عمل ہے۔ اور غیر منصفانہ عمل کے لیے اس دنیا میں بربادی کے سوا کچھ اور مقدر نہیں۔

میں مانتا ہوں کہ اس ملک میں اگر ایسے واقعات ہیں کہ ایک "مصطفےٰ" کو سروس میں لیا گیا ہے تو اسی کے ساتھ ایسا واقعہ بھی موجود ہے کہ کسی "مصطفےٰ" کو سروس میں نہیں لیا گیا۔ مگر مجھے جس چیز سے اختلاف ہے وہ یہ کہ اس کو تعصب اور امتیاز قرار دیا جائے۔ یہ دراصل زندگی کی ایک حقیقت ہے نہ کہ تعصب اور امتیاز۔

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں لازماً یہ ہونا ہے کہ افراد اور قوموں کے درمیان دوڑ جاری رہے۔ اور پھر کوئی آگے بڑھے اور کوئی پیچھے رہ جائے۔ چڑیا گھر میں جو جانور ہوتے ہیں وہ کچھ دن کے بعد سست پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کٹہرے میں وقتی طور ان کے دشمن جانور ڈالے جاتے ہیں تاکہ ان کے لیے دوڑنے اور بھاگنے کا ماحول پیدا کیا جائے۔ یہ قدرت کا اصول ہے، اور مقابلہ اور مسابقت کے اسی اصول میں زندگی کا راز چھپا ہوا ہے ـــــ ایک واقعہ کو قومی تعصب کہیں تو صرف شکایت کا ذہن بنتا ہے، اسی واقعہ کو قومی مسابقت کہیے تو عمل کا جذبہ بیدار ہونے لگے گا۔

کامیابی کے لیے

ایک تاجر سے پوچھا گیا : کامیابی کیا ہے۔ اس نے جواب دیا :

When you wake up in the morning, jump out of bed and shout: Great, another day. Then you're a success.

صبح کے وقت جب تم جاگو تو کود کر بستر سے نکلو اور چلّا کر کہو، عظیم دوسرا دن۔ تب تم کامیاب ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ رات کے بعد ایک نئی صبح کا طلوع ہونا عظیم ترین چیز ہے۔ کیوں کہ وہ ہم کو کام کا ایک اور دن دیتا ہے۔ جس شخص کے اندر کام کا واقعی جذبہ ہو وہ ایسے ایک دن کو پاکر اچھل پڑے گا۔ اور جو شخص کام کا دن پاکر اچھل پڑے وہی اس دنیا میں کوئی بڑا کام کر سکتا ہے۔

زمین پر رات اور دن کا باری باری آنا ساری معلوم کائنات میں ایک انوکھا واقعہ ہے۔ کیوں کہ وسیع کائنات میں یا تو سورج جیسے ستارے ہیں جو آگ کے بہت بڑے الاؤ کی مانند ہیں۔ اور ان میں انسان جیسی زندگی ممکن نہیں۔ اس کے بعد جو سیارے یا سیارچے ہیں۔ مثلاً مریخ یا چاند، ان کی گردش زمین کے برعکس، صرف یک طرفہ ہے۔ یعنی وہ صرف اپنے مدار پر گھومتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ایک حصہ پر مستقل رات اور ان کے دوسرے نصف حصہ پر مستقل دن رہتا ہے۔

زمین وہ استثنائی کرہ ہے جو اپنے مدار پر گھومنے کے علاوہ اپنے محور پر بھی گھومتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس پر رات اور دن باری باری آتے رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حیرت انگیز انتظام ہے۔ اسی طرح اللہ نے انسان کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ دن کے اوقات میں کام کرے اور رات کو اپنی تکان مٹائے۔

آدمی اگر اس پورے نظام پر غور کرے تو زمین پر رات کے بعد دن کا آنا اس کو اتنا عجیب معلوم ہوگا کہ صبح ہوتے ہی وہ واقعۃً بستر سے کود کر کھڑا ہو جائے گا اور خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس نے اس کو کام کا قیمتی موقع عطا فرمایا۔

خوشی کا راز

مارگریٹ لی رنبک (Margaret Lee Runbeck) کا قول ہے کہ ــــ خوشی کوئی منزل نہیں جہاں آدمی پہونچے، بلکہ خوشی سفر کرنے کا ایک طریقہ ہے :

Happiness is not a station you arrive at,
but a manner of travelling.

ہر آدمی خوشی کا طالب ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں کسی کو خوشی نہیں ملتی۔ یہ دنیا اس لیے بنائی ہی نہیں گئی کہ یہاں آدمی اپنی خوشیوں کا گھر تعمیر کر سکے۔ جو شخص خوشی کو اپنی منزل سمجھے وہ کبھی خوشی کو نہیں پا سکتا۔ خوشی صرف اس کے لیے ہے جو خوشی کے بغیر خوش رہنا سیکھ جائے۔

اگر آدمی یہ جان لے کہ اس دنیا میں غم ناگزیر ہے تو وہ غم کے ساتھ رہنا سیکھ جائے گا۔ اس کو نقصان لاحق ہوگا تو وہ فریاد و ماتم نہیں کرے گا بلکہ اس سے اپنے لیے سبق کی غذا حاصل کرے گا۔ اس کی امیدیں پوری نہ ہوں گی تو وہ مایوسی میں مبتلا نہیں ہوگا۔ اس کا یہ شعور اس کے لیے سہارا بن جائے گا کہ اس دنیا میں کسی بھی امیدیں پوری نہیں ہوتیں، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا کوئی معمولی آدمی۔

خوشی اور کامیابی سے اگر آدمی کو کچھ ملتا ہے تو غم اور ناکامی سے بھی آدمی کو بہت کچھ ملتا ہے۔ غم اور ناکامی کے تجربات آدمی کو سنجیدہ بناتے ہیں۔ وہ اس کی سوچ میں گہرائی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے ذریعہ سے وہ نئے نئے سبق سیکھتا ہے۔ غم اور ناکامی کے تجربات آدمی کے پورے وجود کو بدل کر ایک نیا آدمی بنا دیتے ہیں۔ اگر دنیا میں صرف خوشی اور کامیابی ہوتی تو دنیا سطحی اور بے حس انسانوں کا قبرستان بن جاتی۔ یہ دراصل غم اور ناکامی ہی ہے جس کی وجہ سے دنیا کبھی زندہ انسانوں سے خالی نہیں ہوتی۔

زندگی کی تلخیاں آدمی کی زندگی کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہیں جو سونے چاندی کے لیے تپانے کی حیثیت ہے۔ تپانے کا عمل سونے چاندی کو نکھارتا ہے۔ اسی طرح تلخ تجربات آدمی کی اصلاح کرتے ہیں۔ وہ بے چمک انسان کو چمک دار انسان بنا دیتے ہیں۔

تاریخ سازی

بی ٹکمین (B. Tuchman) کا قول ہے کہ تاریخ غلط اندازہ کا ظہور ہے :

History is the unfolding of miscalculation.

اس کا مطلب یہ ہے کہ حال کے اعتبار سے مبصرین تاریخ کے بارہ میں ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ مگر حال جب مستقبل بنتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندازے بالکل غلط تھے۔ مستقبل اکثر حالات میں اس سے مختلف صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو ابتدائی طور پر سمجھنے والوں نے اس کے بارے میں سمجھا تھا۔

مثال کے طور پر ۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش کے درمیان صلح حدیبیہ ہوئی تھی۔ اس وقت قریش کے تمام لوگوں نے یہ سمجھا کہ مسلمانوں نے خود اپنے خاتمہ کے کاغذ پر دستخط کر دیئے ہیں۔ مگر بعد کے سالوں نے بتایا کہ اس بظاہر ہار میں فتح کا عظیم مستقبل چھپا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ۱۹۴۵ میں جب امریکہ کے جنگی جہاز فضا میں چنگھاڑتے ہوئے جاپان پر ایٹم بم گرانے کے لیے روانہ ہوئے تو امریکہ کا اندازہ یہی تھا کہ وہ جاپان کو ہمیشہ کے لیے راکھ کا ڈھیر بنا رہا ہے۔ مگر اس واقعہ کے ۴۰ سال بعد لوگوں نے دیکھا کہ جاپان دنیا کی سب سے بڑی صنعتی طاقت بن کر ابھر آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کو بنانے والا خود انسان نہیں، یہ در اصل خدا ہے جو انسانی تاریخ کو اپنی مرضی کے مطابق کوئی ایک یا دوسری صورت دیتا ہے۔ تاریخ کی صورت گری کا فیصلہ غیب سے ہوتا ہے نہ کہ ظاہری احوال سے۔

تاریخ کے اس مطالعہ میں ان لوگوں کے لیے تسلی کا سامان ہے جن کے متعلق دنیا کے مبصرین سمجھ لیں کہ وہ بجھ چکے ہیں یا ان کو مٹایا جا چکا ہے۔ کیوں کہ واقعات بتاتے ہیں کہ اس دنیا میں بظاہر بجھی ہوئی راکھ سے شرارے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک مٹی ہوئی شئی دوبارہ زندہ اور اور طاقتور بن کر زمین پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہاں بظاہر ایک ختم شدہ طاقت (Spent force) از سر نو زندہ طاقت بن جاتی ہے۔

ظاہری حالات سے کبھی مایوس نہ ہوں۔ عین ممکن ہے کہ تاریخ اگلا ورق الٹے تو ایسا انجام سامنے آئے جو ظاہری حالات سے بالکل مختلف ہو۔

حوصلہ مندی

نوبل انعام یافتہ پروفیسر عبد السلام نے جنوری ۱۹۸۶ میں ہندستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی تقریروں کی رپورٹیں اخبارات میں آتی رہیں۔ ان کی ایک تقریر کی رپورٹ میں حسب ذیل الفاظ شامل تھے :

> Citing the example of South Korea, he said that about 15 years ago, the gross national product per capita there was equal to that of India. However, it was many times more now due to the efforts they had put. Prof. Salam said that a team from South Korea had come to Trieste, Italy, where he stays, and wanted to know how Nobel prizes were won. He said that it was a similar spirit which should be inculcated in the people of the third world.
>
> *The Times of India*, January 16, 1986.

جنوبی کوریا کی مثال دیتے ہوئے پروفیسر عبد السلام نے کہا کہ تقریباً پندرہ سال پہلے اس کی اور ہندستان کی قومی پیداوار فی شخص برابر تھی۔ مگر اب جنوبی کوریا کی کوششوں کے نتیجہ میں اس کی فی شخص قومی پیداوار ہندستان سے کئی گنا زیادہ ہو چکی ہے۔ پروفیسر عبد السلام نے کہا کہ جنوبی کوریا کی ایک ٹیم ٹریسٹ (اٹلی) آئی جہاں وہ رہتے ہیں اور ان سے یہ جاننا چاہا کہ نوبل انعام کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ، یہی وہ روح ہے جو تیسری دنیا کے لوگوں میں پیدا کی جانی چاہیے۔

تلاش کا یہ جذبہ ہی تمام ترقیوں کی بنیاد ہے، خواہ وہ فرد کی ترقی کا معاملہ ہو یا قوم کی ترقی کا معاملہ۔ اور خواہ اس کا تعلق دنیا کی ترقیوں سے ہو یا آخرت کی ترقیوں سے۔ ہر ترقی انھیں لوگوں کے لیے ہے جو اپنے اندر تلاش و جستجو کا کبھی نہ ختم ہونے والا جذبہ رکھتے ہوں۔

تلاش کا جذبہ یہ بتاتا ہے کہ آدمی کے اندر جمود نہیں پیدا ہوا ہے۔ اور جمود تمام ترقیوں کا قاتل ہے۔ جہاں جمود آیا وہاں ترقی کا عمل بھی لازمی طور پر رک جائے گا۔ جمود کی حالت طاری ہونے کے بعد آدمی "مزید" کے شوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور جس سے مزید کا شوق رخصت ہو جائے وہ جہاں ہے وہاں بھی باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ پیچھے جانا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ بالکل آخری صف میں پہونچ جائے گا۔

اسلام اور سائنس

اس مختصر مقالہ میں مجھے اس سوال کی تحقیق کرنی ہے کہ مسلمان موجودہ زمانہ میں سائنس کی تعلیم میں پیچھے کیوں ہوگئے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمان سائنس کی تعلیم میں اس لیے پیچھے ہیں کہ ان کا مذہب سائنس کی تعلیم کا مخالف ہے، یا کم از کم اس کو پسند نہیں کرتا۔ مگر یہ بات حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن میں کثیر تعداد میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں مختلف طریقوں سے اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی چیزوں پر غور کرو۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ اسلام کے ماننے والے زمین و آسمان کی چیزوں کا مطالعہ نہ کریں جس کا دوسرا نام سائنس ہے۔ اسلام کے نزدیک کائنات کے مطالعہ کا سب سے پہلا فائدہ معرفت ہے۔ یعنی مخلوق کے اندر خالق کا مشاہدہ کرنا۔ تاہم جب لوگ کائنات کو قابل غور سمجھ کر اسے دیکھتے ہیں تو اسی سے وہ چیز بھی برآمد ہوتی ہے جس کو سائنس کہا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی اپنی تاریخ بھی اس کی تردید کرتی ہے۔ کیوں کہ تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے سائنس کے شعبوں میں زبردست ترقی کی۔ حتی کہ جس زمانہ میں یوروپ کی قوموں نے سائنس کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا تھا اس وقت مسلمان سائنس کی راہ میں شاندار ترقیاں حاصل کر چکے تھے۔ برٹرینڈ رسل نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ ۶۰۰ء سے ۱۱۰۰ء تک کے دور کو ہم تاریک دور کہتے ہیں۔ یہ مغربی یوروپ کو غیر واقعی اہمیت دینا ہے۔ اسی زمانہ میں چین میں تنگ کی حکومت تھی جو کہ چینی شاعری کا اہم ترین دور ہے۔ اور کئی دوسرے پہلوؤں سے بہت اہم دور ہے۔ اسی زمانہ میں ہندستان سے لے کر اسپین تک اسلام کی شاندار تہذیب چھائی ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جو چیز مسیحیت کے لیے کھوئی ہوئی تھی وہ تہذیب کے لیے کھوئی ہوئی نہ تھی بلکہ اس کے برعکس تھی :

Our use of the phrase 'the Dark Ages' to cover the period, from 600 to 1000 marks our undue concentration on Western Europe. In China, this period includes the time of the Tang dynasty, the greatest age of Chinese poetry, and in many other ways a most remarkable epoch. From India to Spain, the brilliant civilization of Islam flourished. What was lost to Christendom at this time was not lost to civilization, but quite the contrary.

Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy*, p. 395

زمانہ سے آگے

قرون وسطیٰ میں مسلمانوں نے طب اور سائنس کے میدان میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہ تعجب خیز حد تک عظیم ہیں۔ الرازی (۹۳۲ - ۸۶۵) اور ابن سینا (۱۰۳۷ - ۹۸۰) اپنے وقت کے سب سے بڑے ماہرین طب تھے جن کا کوئی ثانی اس وقت کی دنیا میں موجود نہ تھا۔ ابن سینا کی کتاب القانون فی الطب علم طب پر ایک بنیادی کتاب ہے۔ وہ دنیا کے اکثر طبی اداروں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ فرانس میں وہ ۱۶۵۰ء تک داخل نصاب تھی:

Al-Qanun became a classic and was used at many medical schools, at Montpellier, France, as late as 1650 (11/828).

مسلمانوں کے یہ کارنامے عام طور پر مشہور اور معلوم ہیں۔ ان پر بے شمار کتابیں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں ایک سوال ہے۔ اور یہ سوال اس کی توجیہہ کے بارہ میں ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

The greatest contribution of Arabian medicine was in Chemistry and in the knowledge and preparation of medicines; many drugs now in use are of Arab origin, as also are such processes as distillation and sublimation. Often the chemistry of that time was mainly a search for the philosopher's stone, which supposedly would turn all common metals to gold. Astronomers were astrologers and chemists were alchemists. It is, therefore, surprising that, despite all this, the physicians of the Muslim empire did make a noteworthy contribution to medical progress (11/828).

طب عربی کی سب سے بڑی خدمت کیمسٹری اور دواؤں کے علم اور ان کی تیاری کے بارے میں تھی اکثر دوائیں جو آج استعمال ہوتی ہیں ان کی اصل عرب ہی ہے۔ اسی طرح تقطیر اور تصعید جیسے عمل بھی۔ اس زمانہ کی کیمسٹری اکثر و بیشتر پارس پتھر کی تلاش کا نام تھی، جس کے متعلق یہ

گمان کر لیا گیا تھا کہ وہ تمام دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکتا ہے۔ اس زمانہ کے فلکیات داں محض نجومی ہوتے تھے۔ اور کیمسٹری کے علماء صرف کیمیاگری کرتے تھے۔ اس لیے یہ تعجب خیز بات ہے کہ ان سب کے باوجود مسلم عہد کے اطباء نے طب کی ترقی میں قیمتی اضافے کیے۔

اسلام سائنس کا خالق

یہ باتیں وہ ہیں جن کا عام طور پر مورخین نے اعتراف کیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ جدید سائنس خود اسلام کی پیدا کردہ ہے۔ اسلام بلاشبہ سائنس کے لیے نہیں آیا۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ سائنسی انقلاب خود اسلامی انقلاب کی ضمنی پیداوار ہے۔ اسلام اور سائنس کے اس تعلق کو بریفالٹ نے ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ ہماری سائنس پر عربوں کا قرضہ صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے حیران کن نظریات دیے۔ سائنس اس سے زیادہ عربوں کی مقروض ہے۔ یہ خود اپنے وجود کے لیے ان کی احسان مند ہے :

The debt of our science to that of the Arabs does not consist in startling discoveries of revolutionary theories; science owes a great deal more to Arab culture, it owes its existence. The ancient world was, as we saw, pre-scientific. The Astronomy and Mathematics of the Greeks were a foreign importation never thoroughly acclimatized in Greek culture. The Greeks systematized, generalized, and theorized, but the patient ways of investigation, the accumulation of positive knowledge, the minute method of science, detailed and prolonged observation and experimental inquiry were altogether alien to the Greek temperament. Only in Hellenistic Alexandria was any approach to scientific work conducted in the ancient classical world. What we call science arose in Europe as a result of a new spirit of inquiry, of new methods of investigation, of the method of experiment, observation, measurement, of the development of Mathematics in a form unknown to the Greeks. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.

Briffault, *Making of Humanity*, p. 190

یہ ایک علمی اور تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سائنس کا خالق ہے۔ سائنس سادہ طور پر مطالعہ فطرت (Study of nature) کا نام ہے۔ انسان جب سے زمین پر آباد ہے اسی وقت سے فطرت اس کے سامنے موجود ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ فطرت کے مطالعہ اور تسخیر میں انسان کو اتنی زیادہ دیر لگی۔ سائنس کی تمام ترقیاں پچھلے ہزار برس کے اندر ظہور میں آئی ہیں۔ جب کہ اصولاً انھیں لاکھوں سال پہلے ظاہر ہو جانا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ قدیم زمانہ میں شرک کا غلبہ ہے۔ شرک اس میں مانع تھا کہ آدمی فطرت کا مطالعہ

کرے اور اس کی قوتوں کو دریافت کرکے انھیں اپنے کام میں لائے۔

شرک کیا ہے۔ شرک نام ہے فطرت کو پوجنے کا۔ قدیم زمانہ میں یہی شرک تمام اقوام کا مذہب تھا

> For the ancient man, Nature was not just a treasure-trove of natural resources, but a goddess, Mother Earth. And the vegetation that sprang from the earth, the animals that roamed the earth's surface, and the minerals hiding in the earth's bowels, all partook of nature's divinity, so did all natural phenomenon — springs and rivers and the sea; mountains, earthquakes and lightening and thunder.

غرض زمین سے آسمان تک جو چیز بھی انسان کو نمایاں نظر آئی اس کو اس نے اپنا خدا فرض کر لیا اسی کا نام شرک ہے اور یہ شرک اسلام سے پہلے تمام معلوم زمانوں میں دنیا کا غالب فکر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قدیم انسان کے لیے فطرت پرستش کا موضوع (Object of worship) بنی ہوئی تھی۔ پھر عین اسی وقت وہ تحقیق کا موضوع (Object of investigation) کیسے بنتی۔ یہی اصل وجہ ہے جس کی بنا پر قدیم انسان اس طرف راغب نہ ہو سکا کہ وہ فطرت کا مطالعہ کرے۔ تمام قدیم زمانوں میں انسان فطرت کو خدا سمجھ کر اس کے سامنے جھکتا رہا ہے۔ فطرت کو مقدس نظر سے دیکھنا انسان کے لیے اس میں روک بنا رہا کہ وہ فطرت کی تحقیق کرے اور اس کو اپنے تمدن کی تعمیر کے لیے استعمال کرے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ فطرت پرستی (شرک) کے اس دور کو سب سے پہلے جس نے ختم کیا وہ توحید (Monotheism) ہے۔ توحید کے عقیدے نے پہلی بار انسان کو یہ ذہن دیا کہ فطرت خالق نہیں بلکہ مخلوق ہے۔ وہ پوجنے کی چیز نہیں بلکہ برتنے کی چیز ہے۔ اس کے آگے جھکنا نہیں ہے بلکہ اس کو تسخیر کرنا ہے۔ تاہم جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ توحید کے نظریہ کو پہلی بار اسلام نے عملی طور پر رائج کیا تو یہ انقلاب براہ راست اسلام کا کارنامہ قرار پاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کے تمام پیغمبر توحید کا پیغام لے کر آئے۔ ہر دور میں خدا کے جن بندوں نے سچائی کی تبلیغ کی انھوں نے خالص توحید ہی کی تبلیغ کی۔ مگر اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں ایسا نہیں ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ توحید کے نظریہ کو مان لیں اور توحید کی بنیاد پر انسانی معاشرہ میں وسیع انقلاب برپا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے

انسان کبھی توحید کے حقیقی ثمرات سے آشنا نہ ہو سکا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، خدا کا ہر پیغمبر توحید کا پیغام لے کر آیا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ یہ صورت پیش آئی کہ ان کے پیرو ان کے لائے ہوئے دین کی حفاظت نہ کر سکے۔ انھوں نے توحید میں شرک کی آمیزش کر دی۔ مثال کے طور پر حضرت مسیح نے خالص توحید کا پیغام دیا مگر ان کے بعد ان کے پیروؤں نے خود حضرت مسیح کو خدا سمجھ لیا۔ ان کا یہ مشرکانہ عقیدہ مختلف پہلوؤں سے سائنس کی ترقی کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ مثلاً کچھ علمائے فلکیات نے نظامِ شمسی کی تحقیق کی۔ وہ اس حقیقت تک پہونچے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ مگر عیسائی علماء ایسے لوگوں کے سخت مخالف ہو گیے۔ اس کی وجہ ان کا مذکورہ مشرکانہ عقیدہ تھا۔ انھوں نے زمین کو خداوند کی جنم بھومی فرض کر رکھا تھا اس لیے ان کے لیے ناقابل فہم ہو گیا کہ جس زمین پر خدا پیدا ہوا ہو وہ زمین نظامِ شمسی کا مرکز نہ ہو بلکہ اس کی حیثیت محض ایک تابع کی قرار پائے۔ اپنے مشرکانہ عقیدہ کو بچانے کے لیے انھوں نے سائنسی حقیقت کا انکار کر دیا۔

دوسری بات یہ کہ پچھلے تمام پیغمبروں کا مشن صرف اعلان کی حد تک جا سکا وہ عملی انقلاب تک نہیں پہونچا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھی انسانی تاریخ کے پہلے گروہ ہیں جنھوں نے توحید کو ایک زندہ عمل بنایا۔ انھوں نے اولاً عرب میں شرک (مظاہر فطرت کی پرستش) کا مکمل خاتمہ کیا اور توحید کو عملی طور پر انسانی زندگی میں رائج کیا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور قدیم زمانہ کی تقریباً تمام آباد دنیا میں شرک کو مغلوب کر دیا۔ انھوں نے ایشیا اور افریقہ کے تمام بت خانوں کو کھنڈر بنا دیا اور توحید کو ایک عالمی انقلاب کی حیثیت دے دی۔

اہلِ اسلام کے ذریعہ توحید کا جو عالمی انقلاب آیا اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ توہم پرستی کا دور ختم ہو۔ اب مظاہر فطرت کو پرستش کے مقام سے ہٹا دیا گیا۔ ایک خدا انسان کا معبود قرار پایا۔ اس کے علاوہ جو تمام چیزیں ہیں وہ سب صرف مخلوق بن کر رہ گئیں۔

انسانی تاریخ میں اسلام کے ظہور سے جو عظیم تبدیلی آئی اس کا اعتراف ایک امریکی انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رُخ کو موڑ دیا :

Its advent changed the course of human history.

مظاہر فطرت کو پرستش کے مقام سے ہٹانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ فوراً انسان کے لیے تحقیق اور تسخیر

کا موضوع بن گیے۔ مظاہر فطرت کی تحقیق و تسخیر کا آغاز مدینہ میں ہوا۔ پھر دمشق اور بغداد اس کے مرکز بنے اس کے بعد یہ لہر سمندر پار کر کے اسپین اور سسلی میں داخل ہوئی، وہاں سے وہ مزید آگے بڑھ کر اٹلی اور فرانس تک جا پہونچی۔ یہ تاریخی عمل جاری رہا۔ یہاں تک وہ جدید سائنسی انقلاب تک پہونچ گیا۔ مغرب کا سائنسی انقلاب اس اعتبار سے اسلامی انقلاب کا انتہائی نقطہ ہے۔ وہ توحید کے انقلاب کا سکولر نتیجہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو اسلام سائنس کا بانی تھا۔ اور جس کے ماننے والے اپنے ابتدائی دور میں ساری دنیا کے لیے سائنس کے معلم بنے اسی اسلام کے ماننے والے موجودہ زمانہ میں سائنس کی تعلیم میں دوسروں سے پیچھے کیوں ہو گیے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ سیاسی ہے۔ مسلمانوں نے ابتداءً جو سائنسی انقلاب برپا کیا تھا وہ اسپین تک پہونچنے کے بعد مغربی قوموں کی طرف منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد سائنس کی ترقیاں زیادہ تر اہلِ مغرب کے ہاتھوں ہوئیں۔ اس زمانہ میں بھی اگرچہ دنیا کا بڑا حصہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے قبضہ میں تھا مگر سائنس کی ترقی کا کام صلیبی جنگوں کے بعد مغربی یوروپ کے ذریعہ انجام پاتا رہا۔

مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں سائنس کے میدان میں جو ترقیاں کی تھیں اس کا پہلا سب سے بڑا فائدہ ان کو دو سو سالہ صلیبی جنگوں (۱۲۷۰-۱۰۹۵) میں ہوا۔ اس جنگ میں تقریباً سارا یوروپ متحدہ طاقت سے مسلم دنیا پر حملہ آور ہوا تاکہ اپنے مقدس مقامات کو مسلمانوں کے قبضہ سے واپس لے۔ مگر انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ ان مہموں میں کروروں جانیں اور بے پناہ دولت قربان کر دی گئی۔ اور جب یہ سب ختم ہوا تو یروشلم بدستور "بد دینوں" کے قبضہ میں تھا:

> Millions of lives and an enormous amount of treasure were sacrificed in these enterprises. And when all was done, Jerusalem remained in the possession of the "infidels".
>
> *Pears Cyclopaedia*, (1953-1954), p. 539

صلیبی جنگوں کا خاتمہ مسلمانوں کی کامل فتح اور مسیحی یوروپ کی کامل شکست پر ہوا۔ مسلمانوں کی فتح ان کے لیے الٹی پڑی۔ اس کے برعکس عیسائیوں کو ان کی شکست کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ مسلمان اپنی سیاسی فتح پر قانع ہو کر رہ گیے۔ کامیابی کے احساس نے ان کی عملی قوتوں کو ٹھنڈا کر دیا۔

اس کے برعکس مسیحی یوروپ کو اپنی ناکامی کا یہ فائدہ ملا کہ اس کے اندر یہ ذہن پیدا ہوا کہ اپنی کمزوریوں کو معلوم کرکے ان کی تلافی کرے۔ چنانچہ اس کے اندر ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے زور وشور کے ساتھ یہ تبلیغ کی کہ مسلمانوں کی زبان عربی سیکھو اور ان کی کتابوں کا اپنی زبان میں ترجمہ کرو۔ یہ رجحان یوروپ میں تیزی سے پھیلا۔ مسلمانوں کی اکثر کتابیں عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ کی گئیں جو اس وقت یوروپ کی علمی زبان تھی۔ یہ عمل کئی سو سال تک جاری رہا۔ ایک طرف مسلمان اپنی سیاسی کامیابی میں گم تھے، دوسری طرف یوروپ علمی میدان میں مسلسل ترقی کر رہا تھا۔

یوروپ کا یہ علمی سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸ ویں صدی آگئی جب کہ یوروپ واضح طور پر مسلم دنیا سے آگے بڑھ گیا۔

مغربی یوروپ نے سائنس کو جدید ٹکنالوجی تک پہونچا دیا۔ اس نے دستکاری کی جگہ مشینی صنعت ایجاد کی۔ اس نے دستی ہتھیاروں کی جگہ دور مار ہتھیار بنا لیے۔ وہ بری طاقت سے آگے بڑھا اور ابتداءً بحری طاقت اور اس کے بعد فضائی طاقت پر قابو حاصل کر لیا۔ اس طرح مغرب بالآخر ایسی طاقت بن گیا جس کا مقابلہ مسلمان اپنے موجودہ ساز و سامان کے ساتھ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ مغرب جدید قوتوں سے مسلح ہو کر دوبارہ جب مسلم دنیا کی طرف بڑھا تو مسلمان قومیں ان کو روکنے میں ناکام رہیں۔ مغربی قوموں نے مختصر عرصہ میں تقریباً پوری مسلم دنیا پر براہ راست یا بالواسطہ کنٹرول حاصل کر لیا۔

صلیبی جنگوں کے بعد مسلمان اپنی سیاسی فتح کے جوش میں سائنس سے دور ہو گیے تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہی بات ایک اور شکل میں پیش آئی۔ مغربی قوموں کے مقابلہ میں سیاسی شکست نے موجودہ مسلمانوں کے اندر منفی رد عمل پیدا کیا۔ مغربی قوموں نے ان سے ان کا فخر (Pride) چھینا تھا۔ چنانچہ وہ مغربی قوموں سے سخت متنفر ہو کر رہ گیے۔ اپنی رد عمل کی نفسیات کی وجہ سے انھوں نے نہ صرف مغربی قوموں کو برا سمجھا بلکہ مغربی قوموں کی زبان اور مغربی قوموں کے ذریعہ آنے والے علوم کو بھی وہ نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے۔

ایک صدی کی پوری مدت اسی حال میں گزر گئی۔ مسلمان مغربی قوموں سے نفرت کرتے رہے یا ان سے ایسی لڑائیاں لڑتے رہے جو مسلمانوں کی کمتر تیاری کی وجہ سے صرف شکست پر ختم ہونے

والی تھی۔ دوسری طرف دنیا کی دوسری قومیں مغربی زبان اور مغربی علوم کو سیکھ کر تیزی سے آگے بڑھتی رہیں یہاں تک کہ دونوں کے درمیان وہ بعید فاصلہ پیدا ہوگیا جس کی ایک مثال ہم کو ہندستان میں نظر آتی ہے۔ مسٹر کلدیپ نیر نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان تعلیم میں دوسو سال پیچھے ہیں۔ اگر اس کو گھٹایا جائے تب بھی یہ فاصلہ ایک سو سال کے بقدر ماننا ہوگا۔

مغربی قومیں جن علوم کو لے کر آگے بڑھیں وہ سادہ معنوں میں محض علوم نہ تھے بلکہ وہ دورِ جدید میں ہر قسم کی ترقی کی بنیاد تھے۔ چنانچہ جن قوموں نے ان علوم کو سیکھا وہ دنیوی اعتبار سے دوسروں سے آگے بڑھ گئیں۔ مغربی قومیں اور ان کے مقلدین تہذیب و تمدن میں مسلمانوں سے بدرجہا زیادہ فائق ہوگیے۔ یہی وقت ہے جب کہ مسلمانوں میں سرسید (۱۸۱۷-۱۸۹۸) اور اس قسم کے دوسرے مصلحین پیدا ہوئے۔ مگر یہاں پہونچ کر مسلم مصلحین سے تیسری غلطی ہوئی۔ وہ مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہوگیے۔ وہ مغربی تہذیب کی جڑوں کو زیادہ گہرائی کے ساتھ نہ دیکھ سکے۔ وہ مغرب کی طرف بڑھے۔ مگر ان کا بڑھنا مغرب کی تہذیب سے مرعوبیت کی بنا پر تھا نہ کہ مغرب کی قوت کے اصل سرچشمہ (سائنس) کو سمجھ کر اس کو اختیار کرنے کے لیے تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مصلحین کی ساری توجہ مغرب کی زبان، مغرب کے لٹریچر، مغرب کے تمدنی مظاہر پر رہی۔ یہ مغرب سے قریب ہونے والے بھی مغرب کی سائنس سے اسی طرح محروم رہے جس طرح مغرب سے دور رہنے والے اس کی سائنس سے محروم تھے۔ سرسید نے انگلستان کا سفر کیا تو وہاں کی خاص چیز جو وہ اپنے ساتھ لائے وہ ایک صوفہ سیٹ تھا۔ اس کے بجائے اگر وہ سائنس کی کتابیں یا کوئی مشین اپنے ساتھ لاتے تو یقیناً وہ ہندستانی مسلمانوں کے لیے زیادہ بہتر تحفہ ہوتا۔ آخر وقت میں جب مسلمان مغربی تعلیم کی طرف مائل ہوئے اس وقت بھی ان کے ذہن میں ساری اہمیت مغربی تہذیب کی تھی مغربی سائنس سے وہ بدستور دور پڑے رہے۔

سائنسی شعور

سائنس کے میدان میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کی وجہ اگر مختصر طور پر بتانی ہو تو وہ صرف ایک ہوگی: مسلمانوں میں سائنسی شعور نہ ہونا۔

ہندستان کا زمین دار طبقہ جدید تجارت میں پیچھے کیوں ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اندر

تجارتی شعور موجود نہ تھا یہی واقعہ سائنس کے سلسلہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ ایک یا ایک سے زیادہ اسباب کی بنا پر مسلمانوں کے اندر جدید دور میں سائنسی شعور پیدا نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سائنس کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دی اور اگر توجہ دی بھی تو ادھوری شکل میں۔

اس کی ایک واضح مثال وہ فرق ہے جو مسلمانوں کے درمیان دینی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کی اہمیت کا شعور موجود تھا اس لیے انھوں نے اس کا پورا اہتمام کیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں سائنسی تعلیم کا شعور موجود نہ تھا اس لیے وہ اس کا وہ اہتمام نہ کر سکے جس کے بغیر کسی قوم میں سائنسی تعلیم نہیں آسکتی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم رہنماؤں کو جب جدید علوم کی طرف توجہ ہوئی تو انھوں نے کالج اور یونیورسٹیاں تو بنائیں مگر انھوں نے جدید علوم کی ابتدائی تعلیم کا نظام قائم نہیں کیا جو کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خوراک فراہم کرتے ہیں۔ جب کہ انھیں مسلمانوں میں دینی مدارس کی مثال اس سے بالکل مختلف نمونہ پیش کرتی ہے۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے دینی مدرسے قائم کیے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا کہ صرف بڑے بڑے مدرسے قائم کر کے بیٹھ جائیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کیا کہ پورے ملک میں ابتدائی سطح پر دینی تعلیم کا نظام پھیلا دیا۔ آپ جس گاؤں یا جس قصبہ میں جائیں، آپ کو وہاں ابتدائی تعلیم کا مکتب ایک یا ایک سے زیادہ کام کرتا ہوا ملے گا۔ یہی ابتدائی مکاتب دراصل وہ ادارے ہیں جو بڑے بڑے دینی مدرسوں کو غذا فراہم کرتے ہیں۔ اگر یہ ابتدائی مکاتب نہ ہوں تو تمام بڑے بڑے دینی مدرسے سونے نظر آئیں۔

یہی بات جدید سائنس کی تعلیم کے سلسلہ میں بھی ملحوظ رکھنے کی تھی۔ مسلم رہنماؤں کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو خوراک پہونچانے والے ابتدائی اسکول نہ ہوں تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کو طلبہ کہاں سے ملیں گے۔ ہندستان میں مثال کے طور پر ہندو اور عیسائی بہت بڑے پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا نظام قائم کر رہے تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے اس مثال سے کوئی سبق نہیں لیا۔ انھوں نے کالج اور یونیورسٹیاں بنانے کے لیے زبردست کوشش کی مگر ابتدائی اسکول قائم کرنے کی طرف اتنا کم دھیان دیا کہ وہ نہیں کے برابر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ منظر دیکھتے ہیں کہ مسلم کالج اور اسلامی یونیورسٹی تو ہمارے پاس موجود ہیں مگر اس کے اندر مسلم طلبہ موجود نہیں۔ کیوں کہ ان بڑے اداروں کو غذا پہونچانے والے چھوٹے ادارے نہیں۔ مسلمانوں نے اپنے بچوں کو مذہبی جذبے کے تحت ہندو اور عیسائی یا گورنمنٹ کے ابتدائی اسکولوں میں بھیجنا پسند نہیں کیا اور خود ان کے اپنے ابتدائی اسکول موجود نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کے بچوں کی ابتدائی تعلیم اس انداز پر نہ ہو سکی کہ وہ آگے بڑھ کر سائنس کے شعبوں میں داخلہ لے سکیں۔ مسلم رہنماؤں کی اس غفلت کی وجہ جو بھی ہو، مگر یہ ایک واقعہ ہے کہ عملی طور پر یہ ایک بڑا سبب ہے جس نے مسلم قوم کو سائنسی تعلیم میں پیچھے کر دیا۔

بنیادی غفلت

سائنس کی تعلیم میں مسلمانوں کے پیچھے ہونے کا سبب ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ـــــ مسلمان انگریز اور انگریزی میں فرق نہ کر سکے۔ انھوں نے استعماری قوموں کو اور استعماری قوموں کے ذریعہ آنے والے علوم کو ایک سمجھا۔ اول الذکر سے سیاسی اسباب کے تحت انھیں نفرت پیدا ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ثانی الذکر سے بھی نفرت کرنے لگے۔ اگر وہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر سکتے تو یقینی طور پر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی سائنسی تاریخ دوسری ہوتی۔

ہر قوم کے کچھ اپنے قومی علوم ہوتے ہیں۔ ان قومی علوم سے دوسری قوموں کو دل چسپی نہ ہونا ایک فطری بات ہے۔ مزید یہ کہ دوسری قومیں اگر ان قومی علوم سے دل چسپی نہ لیں تو اس سے انھیں کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔

مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ایک علم کو لے کر اٹھتی ہے لیکن حقیقۃً وہ اس کا قومی علم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حیثیت ایک آفاقی علم کی ہوتی ہے۔ یہ علم اپنی حقیقت کے اعتبار سے تمام قوموں کے لیے ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک قوم کے لیے۔ وہ انسانیت کا مشترک سرمایہ ہوتا ہے نہ کہ کسی قوم کا انفرادی ورثہ۔

قدیم صلیبی جنگوں کے بعد یہی صورت حال مغربی قوموں کے ساتھ پیش آئی تھی۔ اُس وقت مسلمان سائنسی علوم کے حامل تھے۔ اور اسی بنا پر وہ مغربی قوموں کو شکست دینے میں کامیاب ہوئے اس وقت مغرب کی حیثیت مفتوح کی تھی اور مسلمانوں کی حیثیت فاتح کی۔ اگرچہ عام طور پر ایسا ہوتا

ہے کہ مفتوح کے دل میں فاتح کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ فاتح کی ہر چیز کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ مگر مغربی قوموں نے یہ نادانی نہیں کی۔ انھوں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے علوم کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا۔ انھوں نے مسلمانوں سے نفرت کی مگر مسلمانوں کے علوم کو انھوں نے آگے بڑھ کر لیا۔ نیز اپنی کوششوں سے اس میں اتنے اضافے کیے کہ بعد کی صدیوں میں وہ ان علوم کے امام بن گیے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ وہ دوبارہ تاریخ کو اپنے حق میں بدلنے میں کامیاب ہو گیے۔

یہی صورت موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آئی۔ مغربی قومیں ان کے لیے فاتح کی حیثیت رکھتی تھیں اس لیے مغربی قوموں سے بیزاری ان کے لیے ایک فطری بات تھی۔ مگر یہاں مسلمان اس ہوش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغرب اور مغربی علوم کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھیں۔ مغربی قومیں جن علوم کو لے کر آگے بڑھی تھیں وہ ان کے قومی علوم نہ تھے بلکہ وہ کائناتی علوم تھے۔ ان کی حیثیت قوت و طاقت کی تھی۔ دور جدید کے مسلم رہنما اگر اس راز کو بروقت جان لیتے تو وہ مغربی علوم کو مغرب سے الگ کر کے دیکھتے۔ مغربی علوم کو وہ اپنے لیے طاقت سمجھ کر حاصل کرتے۔ وہ ان کو خود اپنی چیز سمجھتے نہ کہ غیر کی چیز۔ مگر یہاں دور جدید کے مسلم رہنما اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے۔ انھوں نے بیک وقت مغرب سے بھی نفرت کی اور مغربی علوم سے بھی۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے دور جدید میں مسلمانوں کو سائنس میں پیچھے کر دیا۔ مسلم رہنماؤں نے ایک لمحہ کی غلطی کی تھی مگر اس کا نتیجہ مسلم قوم کو صدیوں کی شکل میں بھگتنا پڑا:

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت شعور کی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، مسلمانوں نے جب صلیبی جنگوں میں مغربی اقوام پر فتح حاصل کی تو وہ فتح کے جوش میں مبتلا ہو گیے۔ اس جوش نے انھیں سائنس کی تحقیق سے غافل کر دیا۔ اس کے بعد موجودہ زمانہ میں یہی واقعہ ایک اور شکل میں پیش آیا۔ مسلمان مغربی قوموں کے مقابلہ میں مفتوح ہوئے تو ان کے اندر مغربی اقوام کے خلاف نفرت جاگ اٹھی۔ وہ نفرت کی نفسیات میں مبتلا ہو کر مغربی سائنس کی طرف سے بے رغبت ہو گیے۔ مسلمان اپنی بے شعوری کے نتیجہ میں فاتح کی حیثیت سے بھی نقصان میں رہے اور مفتوح کی حیثیت سے بھی۔

حصّہ دوم

جدید انسان ایک عجیب مشکل (Dilemma) سے دوچار ہے۔ اس کے پاس ٹکنالوجی ہے مگر اس کے پاس فلسفۂ حیات نہیں۔ اس کے پاس جسمانی سفر کے لیے مشین ہے مگر اس کے پاس روحانی سفر کے لیے عقیدہ نہیں۔ یہی جدید انسان کا اصل مسئلہ ہے۔ برٹرینڈرسل (۱۹۷۰-۱۸۷۲) نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم بجلی کے بارہ میں کیا جاننا چاہتے ہیں۔ صرف یہ کہ اس کو ہم کس طرح اپنے لیے کارآمد بنائیں۔ اس سے زیادہ جاننے کی خواہش بے فائدہ مابعد الطبیعیات میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی ہے:

What do we want to know about electricity? Only how to make it work for us. To want to know more is to plunge into useless metaphysics.
The Impact of Science on Society, p. 93

برٹرینڈرسل اور اس کے جیسے دوسرے بے شمار لوگوں کی اصل مشکل یہ ہے کہ وہ صرف "بجلی کیا ہے" کے سوال کو لینا چاہتے ہیں اور "بجلی کیوں ہے" کے سوال کو نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں۔ مگر انسانی فطرت اس تفریق پر راضی نہیں۔ انسان اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ بجلی کو عملاً استعمال کرنے کے ساتھ اس کی حقیقت کو بھی جاننا چاہیے۔ یہ ایک ایسا لازمی سوال ہے جس سے اپنے آپ کو خالی کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔

نظریاتی سوالات کا جواب معلوم کیے بغیر بھی بجلی ہمارے کارخانوں کو چلاتی ہے اور ہمارے شہروں کو روشن کر رہی ہے۔ مگر انسانی فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ وہ یہیں ٹھہر جائے۔ وہ بجلی کو استعمال کرے مگر بجلی کی حقیقت کو جاننا نہ چاہے۔ آدمی عین اپنی فطرت کے تحت مجبور ہے کہ وہ "بجلی کیا ہے" کے سوال کے ساتھ "بجلی کیوں ہے" کے سوال پر بھی غور کرے۔

اسی دوسری چیز کا نام عقیدہ ہے اور انسان عقیدہ (Faith) کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جدید انسان کی اصل کمزوری یہی ہے کہ اس نے عقیدہ کو کھو دیا ہے۔ اب اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ آج صحیح اور سچا عقیدہ صرف اسلام ہے تو یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ آج کے انسان کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اسلام ہے۔

سائنسی معیار

دورِ جدید کا مذہب اسلام ہے۔ اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جو دورِ جدید کے معیار پر پورا اتر سکے۔ اس لیے اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جس کو دورِ جدید کا مذہب کہنا باعتبار حقیقت درست ہو۔ موجودہ دور سائنسی دور ہے۔ موجودہ دور میں انسان ہر چیز کو سائنسی معیار پر جانچتا ہے۔ جو چیز سائنسی معیار پر پوری اترے اس کو وہ مان لیتا ہے اور جو چیز سائنسی معیار پر پوری نہ اترے اس کو وہ رد کر دیتا ہے۔

ابتداءً ہر مذہب سچا مذہب تھا۔ مگر بعد کو ہونے والی انسانی ملاوٹوں کے نتیجہ میں مذاہب اس قابل نہ رہے کہ وہ سائنس کے مقابلہ میں ٹھہر سکیں۔ جب کہ اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ اور اس بنا پر وہ سائنسی معیار پر صد فی صد پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام موجودہ زمانہ میں بلا مقابلہ کامیابی کی پوزیشن میں ہے، بشرطیکہ اسے جدید انسان کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

سائنسی معیار کیا ہے اور غیر سائنسی معیار کیا، اس کو سمجھنے کے لیے ایک سادہ سی مثال لیجیے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ حقیقت وہ ہے جو مشاہدہ کے ذریعہ معلوم ہو نہ کہ وہ جس کو محض قدیم سندوں کی بنا پر مان لیا جائے۔ مگر یہ مکمل طور پر ایک جدید تصور ہے جو سترھویں صدی سے پہلے بہ مشکل اپنا وجود رکھتا تھا۔ ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے دانت مردوں سے کم ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس کی شادی دوبار ہوئی تھی، اس کو کبھی یہ خیال نہ آسکا کہ اس بیان کی تصدیق اپنی بیویوں کے منھ کو دیکھ کر کرے :

> To modern educated people, it seems obvious that matters of fact are to be ascertained by observation, not by consulting ancient authorities. But this is an entirely modern conception, which hardly existed before the seventeenth century. Aristotle maintained that women have fewer teeth than men; although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives' mouths.
>
> B. Russell, *The Impact of Science on Society* p. 17

مذکورہ مثال کے مطابق سائنسی معیار واقعاتی معیار ہے۔ اور غیر سائنسی معیار قیاسی معیار۔ ارسطو نے محض قیاس کی بنیاد پر یہ مان لیا کہ عورت کے منھ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ اس نے عورت کو

کم تر درجہ کی مخلوق فرض کیا۔ اس لیے اس نے قیاس کیا کہ عورت جب کم تر درجہ کی مخلوق ہے تو اس کے منہ میں دانت بھی نسبتاً کم ہونے چاہئیں۔ اس کے برعکس برٹرینڈ رسل کا ذہن دور جدید میں بنا ہے جو ہر چیز کا واقعاتی تجزیہ چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے کہا کہ قیاس کی بنیاد پر مت مانو بلکہ عورت اور مرد دونوں کا منہ کھول کر ان کے دانت گنو اور پھر دیکھو کہ دونوں کے دانت برابر ہیں یا ایک دوسرے سے کم ہیں۔

قدیم زمانہ قیاسی معیار پر باتوں کو ماننے کا زمانہ تھا۔ اس لیے قدیم زمانہ میں یہ ممکن تھا کہ جو مذہب بھی رائج ہو اس کو قیاسی مفروضات کی بنا پر درست مان لیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ میں آدمی کسی بات کو صرف اس وقت مانتا ہے جب کہ اس سے متعلق تمام حقائق کا تجزیہ کر کے وہ اس کی معقولیت کو بالواسطہ یا براہِ راست طور پر جان چکا ہو۔

یہ وہ معیار ہے جس کو منطبق کرنے کے بعد دوسرے تمام مذاہب اپنے آپ رد ہو جاتے ہیں اس کے بعد صرف اسلام باقی رہتا ہے جو سائنسی معیار پر پورا اترے۔

مذہب توحید

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے اس میں مکمل وحدت ہے۔ پوری کائنات یکساں قسم کے قانون کے تحت نظر آتی ہے۔

ایک برطانی سائنس داں پروفیسر آئن راکس برگ (Ian Roxburg) کائنات کیوں اس قدر یکساں ہے (Why is the universe so uniform?) کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ کائنات تعجب خیز حد تک یکساں ہے۔ ہم خواہ کسی طور پر بھی اس کو دیکھیں، کائنات کے اجزاء میں وہی ترکیب اسی تناسب سے پائی جاتی ہے۔ زمین پر جو طبیعیاتی قوانین دریافت کیے گیے ہیں وہ تحکمی اعداد پر مشتمل ہیں، جیسے کسی الکٹران کی مقدار مادہ کا تناسب ایک پروٹان کے مقدار مادہ سے جو کہ تقریباً ۱۸۴۰ کے مقابلہ میں ایک ہوتا ہے۔ یہی تناسب ہر جگہ اور ہر وقت پایا جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ کیا ایک خالق نے تحکمی طور پر انھیں اعداد کا انتخاب کر رکھا ہے۔ کیا کائنات کے وجود کے لیے ان اعداد میں وہی متناسب قدر ضروری ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ پروفیسر آئن راکس برگ کے اصل الفاظ یہ ہیں :

The universe is astonishingly uniform. No matter which way we look, the universe has the same constituents in the same proportions. The laws of physics discovered on earth contain arbitrary numbers, like the ratio of the mass of an electron to the mass of a proton, which is roughly 1840 to one. But these turn out to be the same in all places at all times. Why? Did a creator arbitrarily choose these numbers? Or must these numbers have the particular uniform value we observe for the Universe to exist?"

Sunday Times (London) December 4, 1977

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ کائناتِ وحدت ہے۔ ایسی کائنات میں صرف توحید کا تصور فٹ بیٹھتا ہے۔ شرک کا تصور سائنسی کائنات کے ساتھ کسی طرح ہم آہنگ نہیں۔

اب مختلف مذاہب کو دیکھئے تو تمام مذاہب مشرکانہ عقائد پر مبنی نظر آتے ہیں۔ پارسی کائنات میں دو خدا مانتے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک خدا کی تعداد تین ہے، ہندوازم میں خداؤں کی تعداد کم سے ۳۳ اور زیادہ سے زیادہ ۳۳ کروربتائی گئی ہے۔ افریقہ کے قبائلی مذاہب میں ہر چیز خدا ہے، صرف ایک انسان ہے جو اس خدائی میں شامل نہیں وغیرہ۔ اس کے مقابلہ میں اسلام نہایت واضح اور قطعی طور پر اس بات کا مبلغ ہے کہ خدا صرف ایک ہے۔ یہاں ایک اللہ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں۔

اسلام اور دوسرے مذاہب کے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ جدید سائنسی دنیا میں جو مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے وہ صرف اسلام ہے جو خالص توحید کا مذہب ہے۔ دوسرے تمام مذاہب جدید سائنسی دنیا میں غیر مطابق ہو کر رہ گیے ہیں کیوں کہ وہ شرک کی تعلیم دیتے ہیں اور شرک کا اصول جدید سائنس کی دریافت کردہ کائنات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں۔

مشرکانہ مذاہب

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب مشرکانہ مذاہب ہیں۔ مشرکانہ مذاہب میں فطرت کے مظاہر کو خدا کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور ان کو مقدس سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ شرک در اصل مظاہر فطرت کی پرستش ہی کا دوسرا نام ہے۔

موجودہ زمانہ میں فطرت کے ان مظاہر کی نہایت تفصیلی تحقیق کی گئی ہے۔ اور ان کے بارے میں قطعی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ یہ معلومات ان مظاہر فطرت کی خدائی کو بے بنیاد ثابت کر رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوازم میں چاند کو دیوتا بتایا جاتا ہے۔ ہندو عقیدہ رکھنے والے لوگ

قدیم ترین زمانہ سے چاند کو پوجتے چلے آرہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں چاند کی علمی تحقیق کی گئی۔ دوربینوں سے اس کا مشاہدہ کیا گیا۔ چاند کی مٹی کو زمین پر لاکر لیبارٹری میں اس کا تجزیہ کیا گیا۔ حتی کہ ستمبر ۱۹۵۹ میں روس کا راکٹ چاند پر اتر گیا۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۶۹ میں امریکی خلاباز نیل آرم اسٹرانگ نے چاند پر اپنے قدم رکھ دیئے۔ اس طرح آخری طور پر معلوم ہو گیا کہ چاند کوئی دیوتائی چیز نہیں ہے۔ وہ محض ریت اور پتھر کا ایک مجموعہ ہے۔

اب ظاہر ہے کہ وہ دین آج کے انسان کا دین قرار پائے گا جو سورج اور چاند کو دیوتا بتا کر اسے پوجنے کے لیے کہتا ہے یا وہ دین جو انسان سے یہ کہہ رہا ہے کہ سورج اور چاند کی پرستش نہ کرو بلکہ تم اس خدا کی پرستش کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے (لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا للہ الذی خلقھن، حم السجدہ ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنسی دور میں چاند کی معبودانہ حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ آج کا ایک شخص جو چاند کے بارے میں جدید سائنسی نقطۂ نظر پر یقین رکھتا ہو وہ اسی کے ساتھ ان مذاہب پر یقین نہیں رکھ سکتا جو چاند کو دیوتا بتاتے ہیں۔ مگر اسلام کے ساتھ یہ مشکل نہیں۔ کیوں کہ اسلام چاند کو اور اسی طرح دوسرے اجرام سماوی کو مخلوق بتاتا ہے نہ کہ خالق اور معبود۔

مذہبی سادگی

اسلام کی ایک خصوصیت اس کی فطری سادگی ہے جو جدید سائنسی ذہن کے عین مطابق ہے۔ جدید انسان کا ذہن نیچر کے مطالعہ سے بنا ہے۔ اس لیے نیچر میں جو سادگی ہے وہی سادگی جدید ذہن کے لیے بھی پسندیدہ چیز بن گئی ہے۔ جدید ذہن کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس میں فطری سادگی ہو۔ جو مذہب فطری سادگی سے خالی ہو وہ جدید ذہن کے لیے قابل قبول بھی نہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے سوا تمام مذاہب فطری سادگی سے محروم ہو چکے ہیں، نظریاتی سادگی سے بھی اور عملی سادگی سے بھی۔

موجودہ مسیحیت جس فلسفیانہ عقیدہ پر قائم ہے وہ تثلیث ہے یعنی تین میں ایک، ایک میں تین۔ ریاضیاتی طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم ہے کہ کوئی چیز بیک وقت ایک بھی ہو اور اسی کے ساتھ تین بھی۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ایک عیسائی پروفیسر سے

پوچھا گیا کہ تثلیث (Trinity) کا مطلب کیا ہے۔ پروفیسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا :

If you ask me I don't know, if you don't ask I know.

یہودیت ایک اور اعتبار سے غیر سادگی کا منظر پیش کرتی ہے۔ موجودہ بائبل میں عبادت اور قربانی کے مراسم (Rituals) اتنے زیادہ بتائے گیے ہیں کہ عام انسان کے لیے تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام مراسم کی پابندی کرتے ہوئے عبادت اور قربانی کر سکے۔

بائبل کے باب کے باب اس قسم کے جزئی مراسم کی تفصیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل ابواب ملاحظہ ہوں :

احبار (Leviticus)

گنتی (Numbers)

اس کے مقابلہ میں اسلام کی عبادت ظاہری رسمیات سے بالکل خالی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی عبادت ایک انتہائی سادہ عمل کا نام ہے۔ سر ایڈورڈ ڈینی سن راس (E. Denison Ross) نے اسلام کی فطری سادگی کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ اسلامی عقیدہ کی سادگی غالباً اسلام کی اشاعت میں زیادہ بڑا عامل تھی بمقابلہ غازیوں کی تلوار کے :

The simplicity of Islamic creed was probably a more potent factor in the spread of Islam than the sword of Ghazis.
Introduction of George Sale's translation of the Quran p. VII

اسلام کی یہ سادگی جس نے قدیم زمانہ میں بے شمار انسانوں کو اسلام کی طرف راغب کیا اس کی وہی سادگی مزید اضافہ کے ساتھ جدید انسان کے لیے کشش کا باعث ہے۔ جدید انسان کا فطرت پسند ذہن اسلام کے سوا کسی اور مذہب میں اپنی حقیقی تسکین نہیں پا سکتا۔

درمیانی واسطہ نہیں

جدید انسان کا ایک خاص ذوق یہ ہے کہ وہ حقیقتوں سے براہِ راست طور پر مربوط ہونا چاہتا ہے۔ موجودہ سائنسی دنیا میں وہ تمام چیزوں سے براہِ راست ربط قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس لیے بالکل فطری بات ہے کہ وہ خدا سے بھی براہِ راست مربوط ہونا چاہے۔ آج کا انسان میکرو کاسمک

ورلڈ (ستاروں اور سیاروں کی دنیا) کو اپنی دوربینوں کے ذریعہ براہِ راست دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ مائکرو کاسمک ورلڈ (بیکٹیریا اور مالیکیول کی دنیا) کو اپنی خوردبینوں کے ذریعہ براہِ راست دیکھ رہا ہے۔ ان تجربات سے اس کا جو ذہن بنتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ حقائق کا براہ راست تجربہ کرے۔

اس اعتبار سے بھی اسلام ہی واحد مذہب ہے جو جدید ذہن کو اپیل کرنے والا ہے۔ دیگر تمام مذاہب میں خدا اور انسان کے درمیان واسطے مقرر ہو گئے ہیں۔ کسی مذہب میں مذہبی پیشواؤں کا واسطہ کسی مذہب میں روحوں کا واسطہ، کسی مذہب میں خدا کے بیٹے اور خدا کے فرشتوں کا واسطہ، وغیرہ۔

جدید انسان خدا سے براہِ راست مربوط ہونا چاہتا ہے لیکن دیگر مذاہب اس کو صرف بالواسطہ انداز سے مربوط ہونے کا راستہ دکھاتے ہیں۔

آج کی دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو خدا سے براہِ راست مربوط ہونے کا طریقہ بتا رہا ہے۔ اسلام کے نزدیک بندے اور خدا کے درمیان ربط قائم ہونے کے لیے کسی تیسرے واسطہ کی ضرورت نہیں۔ آدمی جس وقت چاہے خدا کی طرف متوجہ ہو اور وہ اپنے آپ کو خدا کے ربط (Contact) میں پائے گا۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ

اور جب میرے بندے میرے بارہ میں پوچھیں تو میں قریب ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارتا ہے۔

تاریخی معیار

خدا کی طرف سے جو پیغمبر آئے ان میں سے دو پیغمبر حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ تھے۔ ان دونوں پیغمبروں کا تعلق مصر کی تاریخ سے ہے۔ اس بنا پر جب بھی ان دونوں پیغمبروں کا ذکر آتا ہے تو قدرتی طور پر مصر کی تاریخ بھی اس سے وابستہ ہو جاتی ہے۔

ان دونوں پیغمبروں کا ذکر بائبل میں بھی ہے اور قرآن میں بھی۔ بائبل جب حضرت یوسفؑ کا ذکر کرتی ہے تو ان کے زمانہ کے بادشاہ کا نام وہ فرعون (Pharoah) بتاتی ہے۔ اسی طرح بائبل میں جہاں موسیٰؑ کا ذکر ہے وہاں بھی ان کے ہم عصر بادشاہ کا نام فرعون بتایا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا

اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں جو بادشاہ مصر پر حکومت کر رہا تھا وہ بھی فرعون تھا۔

یہ بات جدید تحقیقات سے غلط ثابت ہوئی ہے۔ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر میں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو چرواہے بادشاہ (Hyksos kings) کہا جاتا ہے یہ لوگ اصلاً مصری نہ تھے بلکہ عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ باہر سے آکر مصر میں اسی طرح حکمران بن گئے جس طرح انگریز ہندستان میں ایک عرصہ تک حکمراں رہے۔ چرواہے بادشاہوں کا یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آخر تک مصر کے اقتدار پر قابض رہا۔ حضرت یوسف کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک یہ خاندان مصر پر حکمران رہا۔ اس کے بعد مصر میں ان کے خلاف بغاوت ہوئی۔ ان کو مصر سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ ایک مصری خاندان کی حکومت قائم ہوئی یہی مصری خاندان ہے جس کے بادشاہوں نے سب سے پہلے فرعون (Pharoah) کا لقب اختیار کیا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ بائبل کا بیان جدید تاریخی تحقیقات سے ٹکرا رہا ہے، بائبل حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ دونوں پیغمبروں کے ہم عصر بادشاہوں کو فرعون کہتی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ فرعون صرف حضرت موسیٰ کے ہم عصر بادشاہ کا لقب تھا نہ کہ حضرت یوسف کے ہم عصر بادشاہ کا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بائبل جدید تاریخی معیار کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ ایک شخص بائبل کو مانے تو اس کو تاریخ کو رد کرنا پڑے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ تاریخ کی تحقیق کو مانے تو اس کی نظر میں بائبل ناقابل اعتبار قرار پائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید انسان مجبور ہے کہ وہ بائبل کو نہ مانے، الا یہ کہ وہ اپنے سائنسی ذہن سے دست بردار ہو جائے۔

مگر قرآن کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں حضرت یوسف کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر ہے اور حضرت موسیٰ کے زمانہ کے بادشاہ کا بھی ذکر۔ مگر قرآن انتہائی بامعنی طور پر دونوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ اس نے حضرت یوسف کے ہم عصر بادشاہ کے لیے عزیز کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی حکمراں یا ذی اقتدار کے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن جب حضرت موسیٰ کا ذکر کرتا ہے تو وہاں وہ ان کے ہم عصر بادشاہ کو واضح طور پر فرعون کہتا ہے۔ گویا قرآن کے نزدیک حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا تھا اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ دوسرا

اس طرح قرآن مکمل طور پر یہ اہلیت رکھتا ہے کہ وہ جدید علم کا سامنا کر سکے۔ کیوں کہ جدید علمی تحقیقات اور قرآن کا بیان دونوں کامل طور پر ایک دوسرے کے موافق ہیں۔ یہاں آدمی کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ قرآن کو ماننے کے لیے جدید علم کو چھوڑنے پر مجبور ہو۔ یا جدید علم کو ماننا اس کے لیے صرف اس وقت ممکن ہو جب کہ وہ قرآن سے دست بردار ہو جائے۔

اسلام کی برتری

مریم جمیلہ ایک امریکی نو مسلمہ ہیں۔ وہ امریکہ کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے مسلم ممالک کا سفر کیا۔ بالآخر ایک پاکستانی مسلمان سے شادی کر لی اور اب وہ پاکستان میں مقیم ہیں ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے اسلام مغرب کے مقابلہ میں (Islam Versus The West) اس کتاب میں وہ اپنی کہانی بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

یونیورسٹی کی تعلیم کے زمانہ میں میں نے ایک مضمون لیا جو "یہودیت اسلام میں" کہا جاتا تھا۔ میرا ربی پروفیسر اپنے طلبہ کو، جو سب کے سب یہودی ہوتے تھے، اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اسلام کا ماخذ یہودیت ہے ہماری نصابی کتاب میں قرآن کی ایک ایک آیت کو لے کر دکھایا گیا تھا کہ کس طرح وہ یہودی ذرائع علم پر مبنی ہے۔ پروفیسر کے لکچر کے ساتھ ہم کو ایسے فلم اور سلائڈ بھی دکھائے جاتے تھے جن میں صہیونیت اور یہودی ریاست کی تعریف ہوتی۔ اگر یہ پروفیسر کا حقیقی مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ اسلام پر یہودیت کی برتری ثابت کرے مگر میرے اوپر اس کا اثر بالکل الٹا پڑا۔

جیسے جیسے میں نے قدیم عہد نامہ اور قرآن کا گہرا مطالعہ کیا، دونوں کا تضاد مجھ پر نمایاں ہوتا چلا گیا۔ ایک معنی میں قدیم عہد نامہ صرف یہودیوں کی تاریخ تھی جو خدا کے چنے ہوئے لوگ تھے۔ قرآن اگرچہ عربی زبان میں ایک عرب پیغمبر پر اترا، اس کا پیغام ایک عالمی پیغام ہے جو تمام نسل انسانی کو خطاب کرتا ہے۔ جب میرے پروفیسر نے بتایا کہ فلسطین پر یہودیوں کا خدائی حق ہمیشہ سے یہودی شریعت کا مرکزی جزء رہا ہے تو مجھے خدا کے اس تنگ نظر عقیدہ سے بہت دھکا لگا۔

کیا قرآن یہ نہیں کہتا کہ: پورب پچھم سب خدا کے ہیں، تم جدھر بھی رخ کرو ادھر خدا تمہارے لیے موجود ہوگا۔ کیا پیغمبر اسلام نے نہیں کہا کہ تمام زمین خدا کی مسجد ہے۔ صہیونیت کہتی ہے کہ یہودیوں کا وطن صرف فلسطین ہے، دوسری جگہ وہ جلاوطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے پروفیسر کا دعویٰ کہ یہودی صرف فلسطین میں رہ کر انسانی تہذیب میں اپنا حصہ ادا کر سکتے ہیں بے بنیاد نظر آتا ہے، جب اس حقیقت کو دیکھا جائے کہ حضرت موسیٰ پر وحی مصر میں آئی۔ تالمود کے انتہائی اہم حصے اس سرزمین میں لکھے گئے جو آج عراق کہا جاتا ہے (صفحہ ۴)

اسلام اتنا برحق مذہب ہے کہ دوسرے مذہبوں سے اس کا سادہ تقابل ہی اس کی برتری ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بائبل ایک قوم کی قومی تاریخ معلوم ہوتی ہے جب کہ قرآن میں عالمی انسانی پیغام ملتا ہے۔ یہودیت کے نزدیک سارا تقدس بس فلسطین کی سرزمین میں ہے جب کہ اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین خدا کی زمین ہے۔ یہودیت کے مطابق ان کے مذہب اور فلسطین کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا جب کہ خود حضرت موسیٰ کو خدا نے فلسطین سے باہر خطاب کیا اور یہودیوں کی مقدس مذہبی کتاب فلسطین کے باہر مرتب کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اتنا کامل اور اتنا برحق دین ہے کہ دوسروں کے سامنے صرف اس کو سادہ صورت میں پیش کر دینا کافی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کو کسی ملاوٹ کے بغیر اس کی اصلی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

جدید تقاضا

موجودہ زمانہ کے ایک مفکر نے لکھا ہے کہ آج کے انسان کے لیے وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جس کی تعلیمات عالمی ہوں اور جس کا فکر عقلیت پر مبنی ہو :

Universal in content and rational in thought

مذکورہ مفکر کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ یہ دونوں صفات آج صرف اسلام کے اندر پائی جاتی ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرا کوئی مذہب نہیں جو دور جدید کے اس معیار پر پورا اترے۔

اسلام اپنی ابتدائی ربانی شکل میں آج بھی کامل طور پر محفوظ ہے۔ جب کہ دوسرے مذاہب کا حال یہ ہے کہ بعد کے زمانوں میں ان کے اندر انسانی آمیزش ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنی آفاقیت بھی کھو دی اور اسی کے ساتھ اپنی عقلیت بھی۔ انسان کی محدودیت نے خدائی مذہب میں شامل ہو کر خدائی مذہب کو بھی محدود کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں انسان اور انسان کے درمیان تفریق پائی جاتی ہے۔ چوں کہ لوگوں کے درمیان تفریق اور امتیاز موجود تھا، انھوں نے اپنی اس عملی حالت کو نظریاتی جواز فراہم کرنے کے لیے اس کو ایک مذہبی چیز بنایا اور پھر اس کو اپنی مذہبی کتابوں میں داخل کر دیا۔ مذاہب میں بادشاہ اور رعایا کی تقسیم، آزاد اور غلام کی تقسیم، کالے اور گورے کی تقسیم، اونچی ذات اور نیچی ذات کی تقسیم، امیر اور غریب کی تقسیم، مذہبی پیشوا اور عام انسان کی تقسیم ـــــ یہ تمام چیزیں اسی تاریخی غلطی کا نتیجہ ہیں۔

یہی معاملہ عقلیت کا بھی ہے۔ انسان کی عقل محدود ہے۔ وہ حد بندیوں میں رہ کر سوچتی ہے اسلام کے سوا ہر مذہب میں ایسا ہوا کہ بعد کے زمانہ میں اس کے ماننے والوں نے اپنی عقل سے اس میں اضافے کیے۔ ان اضافوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خدائی کلام کے ساتھ انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس طرح اس کی ابدیت ختم ہو گئی۔ جو چیز ماضی میں عقلی نظر آتی تھی وہ بعد کے زمانہ میں غیر عقلی ہو کر رہ گئی۔

اب مذاہب کی فہرست میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ رہنے کی وجہ سے ان دونوں صفتوں کو اپنے اندر برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آفاقیت بھی مکمل طور پر ہے اور عقلیت بھی مکمل طور پر۔

خدا کو پانا سب سے بڑی حقیقت کو پانا ہے۔ کوئی آدمی جب خدا کو پاتا ہے تو یہ اس کے لیے ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کی پوری زندگی کو بلا دیتی ہے۔ وہ ایک ناقابلِ بیان ربانی نور میں نہا اٹھتا ہے، وہ ایک نیا انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ، اس کا عمل اور اس کی تمام کارروائیاں ایک ایسے انسان کی کارروائیاں بن جاتی ہیں جو خدا کے ظہور سے پہلے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔

ہدیہ : ۴۰ روپیہ
۳۰ روپیہ (رعایتی اڈیشن)

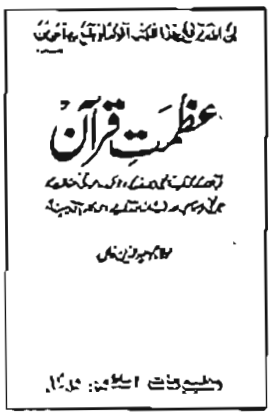

قرآن اپنی ذات میں اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی کتاب ہے۔ وہ اسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا تھا۔ ان خصوصیات نے قرآن کے پیغام کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دنیا کے سامنے اپنی اصلی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوامِ عالم کو مسخر کر لے گا۔

ہدیہ : ۲۵ روپیہ
۱۸ روپیہ (رعایتی اڈیشن)

خط و کتابت

چیف جسٹس کا ریمارک

محمد احمد۔ شاہ بانو کیس (کریمنل اپیل نمبر ۱۰۳ - ۱۹۸۱ - مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۸۵) میں فیصلہ دیتے ہوئے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس وائی۔ وی۔ چندرا چوڑ نے ایک خصوصی نوٹ لکھا ہے۔ اس نوٹ میں وہ کہتے ہیں کہ عام دیوانی اور فوجداری قانون کے تحت کچھ سوالات پیدا ہوتے ہیں یہ سماج کے ایک بڑے حصہ کے لیے دور رس اہمیت کے حامل ہیں جو کہ روایتی طور پر غیر منصفانہ سلوک کا شکار رہا ہے۔ عورتیں اسی قسم کا ایک حصہ ہیں۔ قانون ساز منو نے کہا کہ عورت آزادی کی مستحق نہیں۔ اور اسلام پر یہ الزام ہے کہ اس کا ایک تباہ کن پہلو عورت کو کمتر درجہ دینا ہے۔ پیغمبر اسلام کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے، امید افزا طور پر غلطی سے، کہ عورت ایک ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ اس لیے تم اپنی بیویوں سے نرم سلوک کرو :

> Some questions which arise under the ordinary civil and criminal law are of a far-reaching significance to large segments of society which have been traditionally subjected to unjust treatment. Women are one such segment. "Na stree swatantramarhati" said Manu, the law giver: The woman does not deserve independence. And, it is alleged that the 'fatal point in Islam is the degradation of woman'. To the Prophet is ascribed the statement, hopefully wrongly, that 'Woman was made from a crooked rib, and if you try to bend it straight, it will break; therefore treat your wives kindly.

واضح ہو کہ چیف جسٹس صاحب کی مذکورہ عبارت میں " امید افزا طور پر غلطی سے "، کا مطلب یہ نہیں ہے کہ موصوف کے نزدیک پیغمبر کی طرف اس قول کو منسوب کرنا غلط ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر نے اگرچہ یہ کہا ہے کہ عورت " ٹیڑھی پسلی " سے پیدا کی گئی ہے۔ مگر جو لوگ عورت

اور مرد کے درمیان برابری قائم کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ ہمارے لیے امید کا پہلو یہ ہے کہ پیغمبر کا یہ ارشاد بطور واقعہ درست نہیں۔ چیف جسٹس کے اس فقرہ کا مقصد "بیان" کی تردید ہے نہ کہ خود "انتساب" کی تردید۔

ایک چیف جسٹس کا یہ ریمارک خالص قانونی اعتبار سے کس حد تک بامو قع ہے۔ اس کے بارہ میں کوئی قانون داں ہی قطعی رائے دے سکتا ہے۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ خالص علمی اعتبار سے صحیح نہیں۔

چیف جسٹس صاحب نے پیغمبر اسلام کا یہ قول اس دعویٰ کی تائید میں پیش کیا ہے کہ اسلام سماج کے ایک طبقہ (عورت) کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کی حمایت کرتا ہے۔ حالاں کہ مذکورہ قول اس کے برعکس، عورت کے ساتھ منصفانہ سلوک کی تاکید کر رہا ہے۔ محترم چیف جسٹس کا ریمارک منو کے قول کے لیے تو ضرور درست ہے۔ مگر وہ پیغمبر اسلام کے قول پر بالکل صادق نہیں آتا۔

مذکورہ قولِ رسول میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عورت کے ساتھ نرمی (خیر) کا سلوک کرو۔ پھر اس حدیث کے بارہ میں کس طرح یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک یا کمتر درجہ کا برتاؤ کرنے کی تلقین کی گئی ہے (جیسا کہ منو کے حوالے میں پایا جاتا ہے)

جہاں تک عورت کے پسلی کی مانند ہونے کا تعلق ہے، وہ عورت کے ساتھ بہتر سلوک کی توجیہہ کے طور پر ہے نہ کہ بہتر سلوک کی تردید کے طور پر۔ اس کے بارہ میں اوپر یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ یہ محض ایک مثال ہے۔ عورت کی مخصوص نفسیات کی بنا پر اس کے معاملہ کو پسلی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس سے نرم سلوک کرو۔ اگر تم عورت کے ساتھ سخت سلوک کروگے تو یہ عورت کی فطرت کے مطابق نہ ہوگا، اس سے بگاڑ پیدا ہوگا نہ کہ اصلاح۔

خلاصہ

سورہ نساء کی آیت (خلق منہا زوجہا) کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس جنس سے آدم کو بنایا، اسی جنس سے اس نے آدم کے جوڑے (حوا) کو بھی بنایا تاکہ دونوں میں موافقت رہے۔ اگر ایسا ہوتا کہ دونوں دو الگ الگ جنس ہوتے، مثلاً ایک آگ سے بنایا جاتا اور دوسرا مٹی سے، تو دونوں کے درمیان باہمی توافق نہ ہوتا۔ پھر نہ خاندانی زندگی میں سکون پایا جاتا اور نہ یہ ممکن ہوتا کہ دونوں

مل کر مشترکہ جد وجہد سے تمدن کی تعمیر کریں۔

حدیث (ضلع) میں عورتوں کے بارے میں جو بات ارشاد ہوئی ہے اس کا مقصد تمثیل کی زبان میں یہ بتانا ہے کہ عورتوں کی مخصوص فطری ساخت کی بنا پر ضروری ہے کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا جائے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار مختلف انداز سے یہ نصیحت فرمائی ہے اور خود اپنی پوری زندگی میں اس کا مکمل اہتمام کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں رات کی نمازوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان کے ساتھ ان کے چھوٹے بچے بھی ہوتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ نماز کی اقامت کا بہت خاص اہتمام فرماتے تھے، لیکن خواتین کے ساتھ آپ کی رعایت کا یہ حال تھا کہ نماز میں اگر کبھی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آجاتی تو آپ نماز کو جلد ختم کر دیتے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

انی لاقوم فی الصلوٰۃ ارید ان اطول فیھا فاسمع بکاء الصبیّ فاتجوز فی صلاتی کراھیۃ ان اشق علیٰ اُمّہ

(بخاری، کتاب الصلوٰۃ)

میں مسجد میں نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، یہ چاہتا ہوں کہ اس کو لمبا کروں، پھر میں بچہ کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں اپنی نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس اندیشہ کی بنا پر کہ میں اس کی ماں کو تکلیف دوں گا۔

حدیث رسول میں عورت کو پسلی (ضلع) سے تشبیہ دینا ایک سادہ سی بات ہے۔ اس معاملہ میں جو شبہات پیدا ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ حدیث کو بائبل کے بیان سے جوڑ دیا گیا۔ حالاں کہ مذکورہ حدیث کا بائبل کے بیان سے کوئی تعلق نہیں۔ حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو دوسرے لوگوں نے بھی اپنے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً میتھو آرنلڈ (Mathew Arnold) نے اسی بات کو ان لفظوں میں کہا کہ عورتوں پر دل کی دلیل کام کرتی ہے نہ کہ دماغ کی،

With women the heart argues, not the mind.

خط و کتابت

اوپر ہم نے وہ ریمارک نقل کیا ہے جو ہندستانی سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر چندراچوڑ نے اس معاملہ میں محمد احمد۔ شاہ بانو کیس پر فیصلہ صادر کرتے ہوئے دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ہم نے سابق چیف جسٹس صاحب کو ایک خط روانہ کیا تھا۔ اس خط کا عکس اگلے صفحہ پر نقل کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ پچھلی بحث سے واضح ہے ۔ چیف جسٹس صاحب کا یہ ریمارک خالص علمی اعتبار سے سراسر بے بنیاد ہے ۔ مگر اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ موصوف کو جب بذریعہ خط توجہ دلائی گئی تو انھوں نے اس کا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی ۔ پہلی بار یہ خط انھیں ۱۷ اپریل ۱۹۸۶ کو بذریعہ رجسٹری روانہ کیا گیا تھا ۔ جب کوئی جواب موصول نہ ہوا تو دوبارہ یہی خط ۱۴ مئی ۱۹۸۶ کو انھیں بھیجا گیا ۔ پھر بھی انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا ۔ بار بار ٹیلی فون کرنے کے بعد بھی کوئی کامیابی نہ ہو سکی ۔ ٹیلی فون پر ان سے کہا گیا کہ آپ ملاقات کا وقت دیدیں تاکہ ہم خود گفتگو کے لیے آپ کے یہاں حاضر ہو سکیں ۔ مگر انھوں نے ملاقات کا وقت دینے سے معذوری ظاہر کی ۔ مجبوراً اب یہ خط اس طرح شائع کیا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ جسٹس موصوف کا جواب شامل نہیں ۔

دوسروں پر حکم لگانے کے لیے ہر آدمی با انصاف ہے ۔ مگر جب خود اپنے آپ پر حکم لگانا ہو تو ہر آدمی بے انصاف بن جاتا ہے ۔

الرسالہ ہندی

لوگوں کی طرف سے مسلسل تقاضا ہوتا رہا ہے کہ الرسالہ کا ہندی اڈیشن نکالا جائے ۔ اللہ کے بھروسہ پر اس کے انتظامات کیے جا رہے ہیں ۔ قارئین الرسالہ اور اصحاب ایجنسی اپنی اپنی طلب سے مطلع فرمائیں ۔ الرسالہ ہندی انشاء اللہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہوگا ۔

مینیجر الرسالہ

بسم الله الرحمن الرحيم

المركز الإسلامي

THE ISLAMIC CENTRE

Mr. Y. V. Chandrachud
Ex-Chief Justice
A-503, Som Vihar
R. K. Puram
New Delhi - 110 022

May 14, 1986

Dear Mr. Chandrachud,

I am taking the liberty of addressing myself to you because on going through your verdict on the Mohammed Ahmed-Shah Bano case, I find that one of the statements you make casts unfair aspersions on Islam. You allege that women have been 'traditionally' subjected to unjust treatment, and that the 'fatal point in Islam is the degradation of woman'. To support this, you quote Manu as having stated that woman did not "deserve independence", and the Prophet of Islam as having said, "Woman was made from a crooked rib, and, if you try to bend it straight it will break; therefore, treat your wives kindly."

While Manu's statement bears out your statement, I must point out that you have badly misquoted the Prophet. Nowhere in the Hadith is it stated that woman was made from a crooked rib, this being an ancient Biblical version of God's creation of human life. The word 'rib' was used by the Prophet in a purely metaphorical sense and his actual words were : "Woman is like a rib, if you try to straighten her out, it will break, so treat her kindly."

The Encyclopaedia Brittanica states : "With respect to personality traits, men are characterized by greater aggressiveness, dominance and achievement motivation, women by greater dependency, a stronger social orientation and the tendency to be more easily discouraged by failure than men (19/907)."

Presumably the Prophet, with his great understanding of human nature, had a fine intuitive grasp of the fundamental biological and psychological differences between men and women, particularly the latters' fragility and passivity - and, for this reason, found it necessary to admonish lesser men to treat wives kindly.

I fail to see how "the degradation of women" can ensue from such an injunction.

It would only be fitting, to say the least, if you were now to retract, or amend, your statement, now that this point has been clarified.

I remain,

Yours faithfully

Wahiduddin

Wahiduddin Khan
President

C-29 NIZAMUDDIN WEST NEW DELHI 110013 (India) Telephone 611128

تعمیرِ ملّت

مکان بنانے کا کام بنیاد سے شروع ہوتا ہے

اور

قوم بنانے کا کام شعور بنانے سے۔

ماہنامہ الرسالہ قوم کی تعمیر کا یہی بنیادی کام کر رہا ہے۔

وہ افرادِ قوم کا شعور بنانے میں مصروف ہے۔

اس مہم میں ساتھ دینا ایک تاریخ ساز مہم میں ساتھ دینا ہے۔

الرسالہ کو پڑھیے

الرسالہ کو پڑھائیے

اس وقت یہی سب سے بڑا کام ہے جس میں آپ کو لگنا چاہیے۔

یہی آج کی سب سے بڑی مہم ہے جس میں آپ کو ساتھ دینا چاہیے۔

قوم کی تعمیر میں اپنا حصہ ادا کیجیے

خبرنامہ اسلامی مرکز - ۲۱

۱۔ ۵ مئی ۱۹۸۶ کو شیخ عمر بن عبد العزیز العثمان (ریاض، سعودی عرب) اسلامی مرکز میں آئے اور صدر اسلامی مرکز سے تبادلہ خیال کیا۔ وہ مرکز کی عربی مطبوعات پڑھ چکے ہیں۔ وہ اسلامی مرکز کے کام کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اس کی ترقی کے لیے دعائیں دیں۔

۲۔ تذکیر القرآن جلد دوم کے بارے میں بار بار استفسار آتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو اس کا سخت انتظار ہے۔ اس سلسلہ میں مطلع کیا جاتا ہے کہ تذکیر القرآن جلد دوم کی تحریر اور کتابت دونوں ساتھ ساتھ جاری ہے۔ ایک کاتب مستقل طور پر تذکیر القرآن ہی کا کام کر رہے ہیں۔ تحریر کا کام ۲۸ ویں پارہ تک پہونچ گیا ہے۔ انشاء اللہ ۱۹۸۶ میں دوسری جلد مکمل ہو کر شائع ہو جائے گی۔ پوری تفسیر دو جلدوں میں ہوگی۔

۳۔ اطلاع ملی ہے کہ ایک انگریز نوجوان نے الرسالہ (انگریزی) کو پڑھ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس سلسلہ میں ہم کو جو خط ملا ہے اس کا ایک حصہ یہاں دیا جا رہا ہے:

Here is a piece of good news. Malcolm Oates from England who has been staying in Suat, and sometimes with us here in Peshawar, has accepted Islam and his name is now Abdul Malik. Before taking this decision, at the beginning of April 1986, (I do not have the exact date but think it was 7th April, 1986, i.e. 26 Rajab). *Al-Risala* (English) was the only literature he had read on Islam. He started reading it in October 1985. Since then, he has read an article from *Al-Risala* every day. He made a point of never missing a single reading. He found the articles easy reading because they were short, compelling, and to-the-point. His decision to accept Islam came, while I was away. On my return yesterday, I asked him about the factors which had made him make the Islamic way of life his own. His reply was, "A friend of mine gave me *Al-Risala*, which I read with an open mind. I found it very interesting, because I was reading about Islam for the first time. It was well-edited, and well-presented ... It shows that every experience, every bit of knowledge, is useful." One of the most impressive facts he learnt about Islam was that its Holy Book — The Quran — is preserved in its original state. "I like the fact that it hasn't been altered," he said. "The fact that it is original is very important. If someone else wanted to know about Islam, I would give him the same magazines as you gave me (i.e. *Al-Risala*). They are up-to-date, in modern language, and the examples given are relevant to life today." I hope this news has made you as happy and encouraged as it has made me.

۴۔ تذکیر القرآن کو لوگوں نے پڑھ کر سنانے کے لیے بہت موزوں پایا ہے۔ چنانچہ جگہ جگہ سے اطلاع مل رہی ہے کہ مسجدوں میں روزانہ تذکیر القرآن پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔

۵۔ "تعبیر کی غلطی" کی کتابت مکمل ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہو کر آجائے گا۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۲ میں چھپا تھا۔

۶۔ بمبئی سے اطلاع ملی ہے کہ درج ذیل ادارہ نے یہ انتظام کیا ہے کہ ماہنامہ الرسالہ اور الرسالہ کیسٹ اور مکتبہ الرسالہ کی تمام مطبوعات وہاں سے مل سکتی ہیں۔ کتب فروش اور دیگر حضرات اس پتہ پر رجوع فرمائیں:

کلثوم کتاب گھر۔ ۹ باندرا جامع مسجد۔ مولانا بابالین۔ (آف ایس وی روڈ) باندرا۔ بمبئی ۵۰۔ ٹیلی فون نمبر ۶۴۲۵۲۰۱۔

۷۔ "انسان اپنے آپ کو پہچان" کا ہندی ترجمہ مکمل ہو گیا ہے اور اس وقت پریس میں ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد چھپ کر آجائے گا۔

۸۔ "سنت رسول" کے موضوع پر کیسٹ زیر تیاری ہے۔ جلد ہی اس کی روانگی شروع ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

نئی مطبوعات

راز حیات	صفحات	۲۶۴
حقیقت حج	〃	۱۰۸
تعبیر کی غلطی	〃	۳۴۰
خاتون اسلام	〃	۲۰۰

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحبِ استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کردیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

زر تعاون سالانہ	۳۶ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۲۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک سے

ہوائی ڈاک	۲۰ ڈالر امریکی
بحری ڈاک	۱۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی-۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

الرسالہ

کیسٹ

ماہانہ کیسٹ سیریز

عصری اسلوب میں
اسلامی تعلیمات

مولانا وحیدالدین خاں کی آواز میں

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ	ششماہی (۶ کیسٹ) ۱۴۰ روپیہ	سالانہ (۱۲ کیسٹ) ۲۵۰ روپیہ
بیرونی ممالک سے ۵ ڈالر امریکی	۲۵ ڈالر امریکی	۵۰ ڈالر امریکی

مزید معلومات کے لیے لکھیں

الرسالہ کیسٹ

سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

D(SE) 243
Regd. R.N. No. 28822/76

July 1986
Number 116

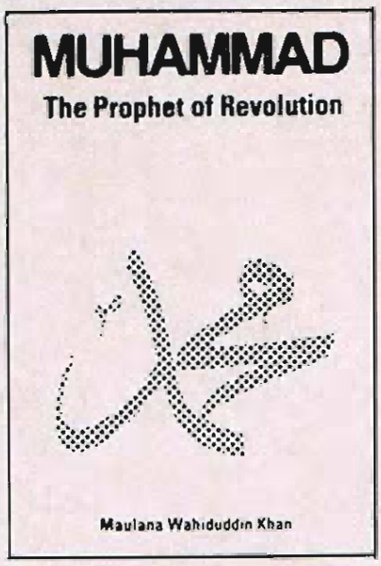

MUHAMMAD

The Prophet of Revolution

By

Maulana Wahiduddin Khan

In making the Prophet Muhammad the greatest figure, and consequently one of the most resplendent landmarks in human history, God has bestowed his greatest favour on mankind. Whoever seeks guidance cannot fail to see him, for he stands out like a tower, a mountain on the horizon, radiating light like a beacon, beckoning all to the true path. It is inevitable that the seekers of truth will be drawn up to the magnificent pinnacle on which he stands.

ISBN 81-85063-00-1 (PB Rs 50 $ 5)
ISBN 81-85063-07-9 (HB Rs 90 $ 9)

Maktaba Al-Risala
C-29 Nizamuddin West New Delhi - 110013